مسئلہ فلسطین

کی مختصر تاریخ



ڈاکٹر حسان بخاری

مسئلہِ فلسطین کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر حسان بخاری

نام کتاب: مسئلۂ فلسطین کی مختصر تاریخ
مصنف: ڈاکٹر حسان بخاری

تعداد:1000
اشاعت اول: اگست 2025
قیمت:700
ناشر: ذوق پبلی کیشنز اٹک،03113002586

انتساب

یحییٰ سنوار شہید کے نام

اظہار تشکر

اس کتاب کے مرتب کرنے میں خوش قسمتی سے مجھے
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کے ہونہار طالبِ علم
علی حسن محترم کی معاونت حاصل رہی۔ان کی مدد کے
بغیر میں اِس کتاب کو بروقت مرتب نہ کر پاتا ۔

فہرست

گردِ القدس

نوعمر گلستان کے احوال پہ جب سے
جوبنِ گردشِ ایام سجا ہے
بے حسی نے ظلم کی آنکھیں نکال لیں
فریاد کے چہرے پر کہرام سجا ہے

جلتا ہے لپٹتا ہے لوئے چراغ سے
پروانہِ غیرت سرِ انجام سجا ہے
ہمتِ مردانِ فلسطیں پہ صد سلام
لبِ ایثار پر قصیدہِ خدام سجا ہے

ہر سنگِ جفا پر ہیں تحمل سے ہم کلام
دل جن کا سوزِ کرب سے ہر شام سجا ہے
لاکھوں سلام مادر وزن ہائے غزہ پر
قدسیِ نغمہِ رشک سے ہر گام سجا ہے

چشمِ عہد سے اشک بھی روتے ہوئے آئے
کہ استقبال کو بس دامنِ پُرخام سجا ہے
خوں ریزیِ مسلم پہ ہے مسلم جہاں کا حال
تیغ ہے زنگ زدہ، دستہ و نیام سجا ہے

المختصر اوہام کے بخیے ادھڑ گئے
دستِ فہم میں خنجرِ دشنام سجا ہے
ملبوسِ علم بردارِ حقوقِ جہان میں
مغرب بتِ کم علمیِ عوام سجا ہے

(علی حسن محرّم)

تعارف

ہر جدو جہد فطری طور پر علمی قابلیت کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر ہم فلسطین کی حمایت کے لیے پاکستان میں ہونے والی جدو جہد کی بات کریں تو اس تناظر میں تاریخ سے لاعلمی ایک اہم مسئلہ ہے، جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا خلا صرف مظاہروں میں شمولیت اور نعروں سے پُر نہیں ہوسکتا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے تاریخ سے آگہی ضروری ہے۔ "مسئلۂ فلسطین کی مختصر تاریخ" اسی مقصد کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس مختصر تاریخ کو بغور پڑھنے والے مسئلۂ فلسطین کی تاریخ کے ماہر تو نہیں بنیں گے مگر وہ اس مسئلے کے تمام اہم پہلوؤں اور واقعات سے کچھ واقفیت ضرور حاصل کرلیں گے۔ علاوہ ازیں وہ فلسطین کے متعلق پاکستان میں پھیلائے جانے والے جھوٹے پراپگنڈے (جس کو کچھ اسرائیلی نواز بکاؤ صحافی اور یوٹیوبرز پھیلاتے رہے ہیں اور نوجوان ذہنوں کو مسموم کررہے ہیں) کا تدارک بھی علم کی روشنی اور تاریخی حقائق سے کرسکیں گے۔

قَدۡ خَلَتۡ مِن قَبۡلِكُمۡ سُنَنٞ فَسِيرُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَٱنظُرُواْ كَيۡفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلۡمُكَذِّبِينَ هَٰذَا بَيَانٞ لِّلنَّاسِ وَهُدٗى وَمَوۡعِظَةٞ لِّلۡمُتَّقِينَ وَلَا تَهِنُواْ وَلَا تَحۡزَنُواْ وَأَنتُمُ ٱلۡأَعۡلَوۡنَ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ۔

سورۃ آلِ عمران، آیت (137، 138، 139)

"تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا، جنہوں نے (اللہ کے احکام و ہدایت کو) جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت اور نصیحت۔ دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔"

ہماری ذمہ داری ہے کہ حق کو پھیلائیں، جھوٹ کو بے نقاب کریں، حقائق کا تجزیہ کریں اور اپنے فلسطینی بھائیوں کی امداد کے لیے ہر قسم کی علمی اور عملی کاوش کریں۔ علم مومن کی گمشدہ میراث ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں موجود تمام سیاسی و تاریخی موضوعات کا سنجیدگی سے مطالعہ

کریں۔ دعا ہے کہ اس سے آپ کے علم کی پیاس اور بھی بڑھے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے نیک مقصد میں شامل ہر کوشش قبول فرمائے اور ہمارے فلسطینی بھائیوں کو جلد صیہونی جبر سے آزادی اور اپنے آزاد وطن کی نعمت سے فیض یاب کرے۔ آمین!

فلسطین میں یہودیوں کی آمد

فلسطین میں یہودیوں کی آمد آج سے تقریباً 3500 سال پہلے ہوئی۔ فلسطین کو انبیا کی سرزمین اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں بنی اسرائیل کے کئی انبیا مبعوث ہوئے۔ فلسطین میں بنی اسرائیل اہلِ یہود کو پہلی بار اقتدار حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمانؑ کے دور میں نصیب ہوا۔ یہ تقریباً 3000 سال پہلے کی بات ہے (10 ویں صدی قبل مسیح)۔ حضرت سلیمانؑ نے القدس میں یہودیوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ "ہیکل سلیمانی" تعمیر کروائی۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد اہلِ یہود کی یہ پہلی سلطنت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ شمالی حصے کو اسرائیل جبکہ جنوبی حصے کو یوداہ (Judah) کا نام دیا گیا۔ اسرائیل کی ریاست 300 سال قائم رہ کر ختم ہوگئی۔ جبکہ "یوداہ" تقریباً 400 سال بعد بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں 587 قبل مسیح میں برباد ہوگیا۔ القدس بھی یوداہ کا ہی حصہ تھا۔ نتیجے کے طور پر بخت نصر نے ہیکل سلمانی کو بھی برباد کر دیا۔ بخت نصر یہودیوں کی بڑی تعداد کو بطور غلام ساتھ لے گیا۔ ایران کے بادشاہ سائرس نے ان کو کچھ عرصے بعد رہائی دے دی۔ لیکن ان کی اکثریت نے بابل (عراق) میں ہی رہنا پسند کیا اور تھوڑے سے لوگ ہی واپس فلسطین آئے۔ 140 قبل مسیح میں یہودیوں کو ایک بار پھر القدس اور ملحقہ علاقوں پر اقتدار قائم کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے ایک چھوٹی سی ریاست دوبارہ بنالی۔ 80 سال بعد یہودی ریاست رومی سلطنت کی باج گزار بن گئی اور حقیقی آزادی کھو بیٹھی۔ 37 قبل مسیح میں اِس یہودی کٹھ پتلی ریاست کا حکمران ہروڈ (Herod) بنا۔ اسی بادشاہ نے ہیکل سلمانی کو دوبارہ تعمیر کیا، جس کو دوسرے ٹمپل (Second Temple) کا نام دیا گیا۔ موجودہ "دیوارِ گریہ" جو القدس میں مسجدِ اقصیٰ کے قریب واقع ہے، اسی دوسرے ٹمپل کی یادگار ہے۔

ہروڈ کے بعد اہلِ یہود کو دوبارہ آزادی کے خواب آنے لگے اور 70 عیسوی میں انہوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کردی۔ رومیوں نے اس بغاوت کو سختی سے کچل ڈالا اور یہودیوں کو القدس سے باہر نکال دیا۔ دوسرا ٹمپل بھی انہوں نے برباد کردیا اور اِس کی صرف

ایک دیوار ہی بچی جس پر یہودی رو پیٹ کر اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں۔اس کے بعد اہلِ یہود کو فلسطین میں اقتدار حاصل نہ ہوا۔ اکثر یہود ارد گرد کے علاقوں میں پھیل گئے اور فلسطین چھوڑ گئے۔ ان کی کچھ تعداد یورپ میں بھی آباد ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ آج کے اکثر یہودی (Ashkenazi Jews) انہی کی نسل سے ہیں۔ فلسطین کے اندر جو یہودی باقی رہ گئے تھے ان کو بار بار رومی سلطنت کی طرف سے مظالم کا شکار بنایا جاتا رہا۔ یہود پر مظالم کا یہ سلسلہ 638ء میں ختم ہوا جب حضرت عمر بن خطابؓ کی قیادت میں اسلامی افواج نے فلسطین کو فتح کیا۔

مسلمان فلسطین میں

فلسطین میں اسلام 638ء میں پہنچا۔ البتہ فلسطین کے مسلمانوں کے آباؤ اجداد اس ملک میں ہزاروں سالوں سے موجود تھے۔ یہاں اسلام اور یہودیت میں ایک فرق واضح ہوتا ہے۔ آج سے 3000 سال قبل جب اہلِ یہود نے فلسطین پر اپنا اقتدار قائم کیا تھا تو انہوں نے فلسطین کے مقامی لوگوں کو (جنہیں "کنعانی" بولتے ہیں) اپنے اندر شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ اہلِ یہود نے کنعانیوں کو یہودی مذہب پر قائل کرنے کے بجائے یا تو قتل کیا یا ملک بدر کر دیا، تاکہ خالص بنی اسرائیل کی نسل کے لوگ یہودی قوم کا حصہ رہیں اور فلسطین پر حکومت کریں۔ یہودیوں نے کچھ عرصہ فلسطینیوں پر حکومت تو کر لی لیکن کنعانیوں کو کبھی مکمل طور پر ملک بدر نہ کر سکے۔ آخر کار رومی سلطنت کے دور میں یہودیوں کی بھاری اکثریت خود فلسطین سے انخلا کر گئی، جبکہ کنعانی اپنی زمین پر موجود رہے۔ رومی سلطنت کے زیرِ سایہ کنعانیوں کی بڑی تعداد نے عیسائیت قبول کر لی۔

عیسائیت کو اس وقت فرقہ واریت کے شدید مسئلوں کا سامنا تھا۔ شام اور فلسطین کے عیسائی قسطنطنیہ (رومی سلطنت کا دارالحکومت) کے رومیوں سے مختلف عقائد رکھتے تھے۔ اِس وجہ سے جس دور میں مسلمانوں نے فلسطین فتح کیا، اُس وقت فلسطینی عیسائیوں کو رومی سلطنت کی طرف سے کافی دباؤ کا سامنا تھا۔ رومی سلطنت میں بھی نسل پرستی کا راج تھا اور فلسطینی عیسائیوں کو رومی عیسائیوں کے برابر حقوق نہیں دیے جاتے تھے۔

اِن حالات میں جب حضرت عمرؓ کی قیادت میں اسلام اخوت اور مساوات کا پیغام لے کر آیا تو فلسطینی عیسائی جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ اِس طرح فلسطین میں یہودیوں سے بھی ہزاروں سال پہلے رہنے والی قوم نے اسلام اور عربی زبان کو اپنا لیا۔ اس کے بعد سے آج تک فلسطین کے تاریخی باشندے عرب اور اسلام کا جزوِ لازم بن گئے۔ 638ء سے لے کر 1099ء تک فلسطین میں مسلمانوں کا اقتدار رہا۔ اِن 450 سالوں میں عیسائی اور یہودی اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا، جس کی وجہ سے ارضِ فلسطین میں تینوں ابراہیمی مذاہب

(یہودیت، عیسائیت اور اسلام) نہ صرف زندہ رہے بلکہ پنپتے بھی رہے۔ یہ اسلامی اخلاقیات کا ہی اعجاز تھا کہ انبیا کی سرزمین پر تاریخ میں پہلی بار مختلف مذاہب کو امن اور چین سے رہنے کا موقع ملا۔

صلیبی جنگیں

گیارہویں صدی عیسوی میں یورپ میں صلیبی جنگوں کی تحریک برپا ہوئی۔ ایک مذہبی جنگی جنون نے پورے یورپ کے عیسائیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پوپ اربن دوم (Pope Urban II) نے 1095ء میں یورپ میں القدس پر عیسائیوں کا قبضہ کرانے کی غرض سے پہلی صلیبی جنگ کا علم بلند کیا۔ یورپ کے تمام علاقوں سے ہزاروں عیسائیوں پر مشتمل کئی لشکر ارضِ فلسطین کی طرف روانہ ہو گئے۔

مسلمان اس وقت آپس میں انتشار کا شکار تھے اور باہمی لڑائی میں بہت زیادہ مصروف تھے۔ اس وجہ سے صلیبی لشکروں کو فتوحات در فتوحات نصیب ہوئیں اور 1099ء میں انہوں نے فلسطین اور القدس پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اسلامی اور صلیبی اخلاقیات کا فرق فوراً ہی واضح ہو گیا، جب صلیبیوں نے ارضِ فلسطین کے اندر رہنے والے مسلمانوں اور یہودیوں کا خوفناک قتل عام کیا۔ ارضِ فلسطین، جہاں 450 سال سے تینوں مذاہب کے لوگ امن سے رہ رہے تھے، میں اب صرف ایک مذہب بچا اور باقی مذاہب کے ماننے والوں کو تلف کر دیا گیا۔

1099ء سے 1187ء تک فلسطین کے اندر صلیبیوں کا اقتدار رہا۔ 1187 میں صلاح الدین ایوبی نے القدس کو آزاد کرایا اور اس کے 100 سال کے اندر مسلمانوں نے فلسطین کے اندر صلیبیوں کی تمام چھوٹی موٹی ریاستوں کو تلف کر دیا۔ اس طرح ایک بار پھر فلسطین کے اوپر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ صلیبی جنگوں کا یہ 200 سالہ دور، جو 1099ء سے 1291ء تک چلا، کافی اہم ہے۔ اس میں ہمیں اسرائیل کی موجودہ ناجائز ریاست کے ساتھ مماثلتیں بھی ملتی ہیں۔ اسرائیل کی طرح صلیبیوں نے بھی فلسطین میں مکمل نسل کشی (Genocide) کی بھرپور کوشش کی۔ اسرائیل کی طرح صلیبیوں کی فوجی اور معاشی قوت کا انحصار بھی بیرونی امداد اور مقامی لوگوں کی لوٹ مار کرنے پر تھا۔

آج کل کے دور کے مسلم حکمرانوں کی طرح اُس دور کے مسلمان حکمرانوں کی اکثریت بھی اپنے جاہ و اقتدار کے لیے صلیبیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپتی رہی

اور صلیبی سازشوں کے ذریعے مسلمان حکمرانوں کو آپس میں لڑواتے رہے۔ فلسطین کی آزادی تب ہی ممکن ہوئی جب پہلے نورالدین زنگی اور پھر صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں مسلمان متحد ہوئے اور جان و مال کی پروا کیے بغیر فلسطین کی آزادی کے لیے میدانِ کارزار میں کود پڑے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اس لیے جب تک مسلمان اتحاد اور قربانی کے جذبے سے معمور ہو کر فلسطین کی آزادی کے لیے نہیں نکلتے، تب تک بیت المقدس پر صیہونی جھنڈا لہراتا رہے گا۔

اہل یہود سے مسلمانوں اور عیسائیوں کا سلوک

اسرائیل کے قیام سے قبل پچھلے دو ہزار سالوں سے یہودی پوری دنیا میں محکوم ہی چلے آ رہے تھے۔ کہیں پر مسلمانوں کے زیرِ اقتدار (فلسطین، عراق، مصر، اور سپین میں) تو کہیں پر عیسائیوں کے (یورپ میں)۔ عیسائیوں کے زیرِ سایہ یہود پر کافی مظالم توڑے گئے۔ صلیبی جنگوں کی تحریک کے دوران یورپ اور فلسطین میں یہودیوں کے قتل ہائے عام کیے گئے۔ یورپ میں ان کی ایک بڑی تعداد کو جبراً عیسائی بنایا گیا۔ کئی ملکوں سے ان کو جلاوطن بھی کیا گیا۔ مثلاً آج ساری دنیا کو انسانیت اور تہذیب کا سبق پڑھانے والے برطانیہ سے، 1290ء میں بادشاہ ایڈورڈ اول (King Edward I) کے حکم سے، تمام یہودیوں کو نکالے جانے کا حکم صادر ہوا۔ 1492ء میں جب سپین میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوا تو سپین میں رہنے والے تمام یہودیوں کو نئی عیسائی حکومت نے یا تو مار ڈالا یا جلاوطن کر دیا۔

اس کے برعکس اسلامی مملکتوں میں اہلِ یہود کے ساتھ رواداری برتی گئی۔ مثلاً جب برطانیہ اور فرانس میں یہودیوں کو ہر قسم کے مظالم کا شکار بنایا جا رہا تھا، اسی دور میں صلاح الدین ایوبی کی وسیع و عریض سلطنت میں یہودیوں کو تمام شہری حقوق حاصل تھے۔ ایک یہودی ابنِ میمون (Maimonides) تو صلاح الدین ایوبی کے دربار میں شاہی طبیب اور وزیر کے درجے تک جا پہنچا۔ جب عیسائیوں نے سپین سے یہودیوں کو نکالا تو ان کو عثمانی سلطنت نے پناہ دی۔

یہ تھا فرق اسلام اور یورپی اخلاقیات میں۔ عجب بات یہ ہے کہ درجنوں انبیا کو بے دردی سے شہید کرنے والی یہودی قوم نے ایک بار پھر اپنے محسنوں کو ہی ڈسا اور 20ویں صدی عیسوی میں یورپی سامراج کے تعاون سے فلسطین میں نسل کشی (Genocide) کے ذریعے اپنی ناجائز ریاست کی داغ بیل ڈالی۔

صیہونی تحریک

عبرانی زبان میں القدس کو صیہون (Zion) کہا جاتا ہے۔ 19 ویں صدی عیسوی میں یورپی یہودیوں میں صیہونی تحریک کا اغاز ہوا۔ اس تحریک کا مقصد دنیا بھر کے یہودیوں کو واپس فلسطین میں لانا تھا تاکہ وہ اُدھر اپنی ایک آزاد ریاست قائم کرسکیں۔

صیہونی تحریک کا پس منظر یہ تھا کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ میں عیسائی مذہب کی سیاسی قوت بہت کمزور ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں مغربی یورپ (فرانس، برطانیہ، جرمنی وغیرہ) اپنی عسکری قوت کے بل بُوتے پر پوری دنیا میں غالب آرہا تھا۔ دولت اور قوت کی فراوانی کی وجہ سے مذہبی جذبات سرد پڑ رہے تھے اور سیکولرازم عیسائی مذہب کو پیچھے چھوڑ رہا تھا۔ سیکولرازم (اس نظریے کے مطابق دین اور سیاست میں مکمل جدائی برقرار رکھی جاتی ہے) کی بدولت مغربی یورپ میں پہلی بار یہودیوں کو برابر کے حقوق ملے۔ یہودیوں نے بنکاری، مالیات (Finance) اور ذرائع ابلاغ کے شعبوں میں بہت تیزی سے ترقی کی۔ 19 ویں صدی تک مغربی یورپ میں ایک طاقتور یہودی اشرافیہ پیدا ہوچکی تھی۔

دوسری طرف مشرقی یورپ میں (جہاں یورپی یہودیوں کی اکثریت رہتی تھی) روسی سلطنت کا ڈنکا بجتا تھا، جو ابھی بھی عیسائی مذہبی اقدار کو مقدم رکھتی تھی۔ نتیجے کے طور پر 19 ویں صدی میں مشرقی یورپ کے یہودیوں پر روس میں فسادات کے ذریعے کچھ مظالم ہوئے۔ ویسے بھی روسی سلطنت میں یہودی ابھی بھی دوسرے درجے کے شہری ہی تصور ہوتے تھے۔

صیہونی تحریک کو مشرق اور مغربی یورپ کے یہودیوں نے قبول تو کرلیا مگر مختلف وجوہات کی بنا پر۔ مشرقی یورپ کے یہودی روسی حکومت کے ظلم وستم سے بچ کر آزاد ریاست بنانا چاہتے تھے۔ جبکہ مغربی یورپ کے یہودی کچھ اور اونچے ارادے رکھتے تھے۔ مغربی یورپ کی یہودی اشرافیہ کے قائدین قومیت (Nationalism) کے یورپی نظریے سے متاثر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر یورپی قوم کی طرح ان کی بھی ایک قومی ریاست (Nation-state) ہونی چاہیے اور ایک قومی یہودی ریاست بنا کر ہی وہ یہودی قوم کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز کرسکتے

ہیں۔

صیہونی تحریک کے بانی ایک آسٹرین صحافی تھیوڈور ہرزل (Theodore Herzl) تھے۔ ہرزل کو آج اسرائیل میں وہی درجہ حاصل ہے جو پاکستان میں علامہ اقبال کو حاصل ہے۔ ہرزل نے اسرائیلی ریاست کا خواب دیکھا اور اس ریاست کے نظریے کو واضح کرنے کے لیے ایک کتاب "یہودی ریاست" (Der Judenstaat) لکھی۔ اس کتاب میں اس نے اسرائیلی ریاست کے خدوخال واضح کیے اور کھلے عام یہ تسلیم کیا کہ اسرائیلی ریاست آبادکاری استعمار (Settler Colonialism) کے نظریے پر قائم ہوگی۔ یورپی ریاستوں کی امداد حاصل کرنے کے لیے اس نے یہ بھی لکھا کہ "یہودی ریاست ایشیا کے اندر یورپ کے دفاع کی دیوار بن کر کھڑی ہوگی اور ایشیا کے وحشیوں سے یورپی تہذیب کا دفاع کرے گی"۔

مختصراً ہرزل اور صیہونی تحریک کے دیگر قائدین یورپی نسل پرستی کے مرض میں مبتلا تھے اور فلسطین کے اصلی باشندوں کو وحشی قرار دے کر ان کی نسل کشی (Genocide) کرنا چاہتے تھے تاکہ ارضِ فلسطین میں 2 ہزار سال بعد یہودیوں کا اقتدار دوبارہ قائم ہو جائے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ صیہونیت (Zionism) کا کل فلسفہ ہی استعمار (Colonialism)، نسل پرستی (Racism) اور نسل کشی (Genocide) پر قائم ہے۔

صیہونی تحریک کے تحت فلسطین میں یہودیوں کی دوبارہ آمد

19 ویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب صیہونی تحریک نے زور پکڑا تو اس وقت فلسطین سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھا۔ فلسطین کی آبادی میں اس وقت تقریباً 85 فی صد مسلمان، 10 فی صد عیسائی اور پانچ فی صد کے قریب یہودی شامل تھے۔ 1880ء کی دہائی میں صیہونی تحریک نے یورپی یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کے لیے بھیجنا شروع کر دیا۔ 1882ء میں پہلی یہودی بستی ریشون لذایون (Rishon Lezion) کے نام سے قائم کی گئی۔ اس بستی کو مشہور زمانہ روتھ چائلڈ خاندان (Rothschild Family) کے مالی تعاون سے قائم کیا گیا۔ آج ریشون لذایون اسرائیل کا چوتھا بڑا شہر ہے جس کی آبادی ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہے۔

19 ویں صدی کے آخر میں ہرزل عثمانی سلطان عبدالحمید دوم سے ملا۔ اس نے سلطان کے سامنے یورپی یہودیوں کے مصائب کا رونا رویا اور درخواست کی کہ سلطان فلسطین کو صیہونیوں کے ہاتھ فروخت کر دیں، تاکہ وہ وہاں اپنی ریاست بنا سکیں۔ ہرزل نے سلطان کو یہ پیشکش بھی کی کہ یہودی اس کے بدلے میں سلطنتِ عثمانیہ کا سارا قرضہ ادا کر دیں گے۔ یاد رہے کہ اس وقت سلطنتِ عثمانیہ دیوالیہ ہو چکی تھی اور سخت مالی مسائل کا شکار تھی۔ لیکن سلطان عبدالحمید دوم نے ہرزل کو دوٹوک جواب دیا اور کہا، "یہ سرزمین ہم نے اپنے خون سے حاصل کی ہے اور اپنے خون سے ہی ہم اس کا دفاع کریں گے۔" صیہونی سازشوں کو بھانپتے ہوئے سلطان نے ایک حکم بھی جاری کر دیا، جس کے ذریعے یورپی یہودیوں پر فلسطین میں زمین خریدنے پر پابندی لگا دی گئی۔ بدقسمتی سے عثمانی سلطنت میں اس وقت بدعنوانی کا دور دورہ تھا اور صیہونیوں نے مقامی افسروں کو رشوت دے کر سلطان کے اس حکم کو غیر مؤثر بنا دیا۔

سلطان عبدالحمید دوم نے ہرزل کو جواب تو دے دیا مگر ہرزل نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے 1897ء میں بین الاقوامی صیہونی تنظیم (World Zionist Organization) قائم کی، جس کا واحد مقصد ایک صیہونی ریاست کا قیام تھا۔ 1901ء میں یہودی قومی فنڈ

(Jewish National Fund) کا اجرا کیا گیا۔ اس فنڈ کے پیسوں کو خرچنے کے لیے سخت قوانین وضع کیے گئے۔ یہ واضح کیا گیا کہ فلسطین میں جو بھی زمین اس فنڈ کی رقم سے خریدی جائے گی اس پر صرف یہودی ہی رہ سکیں گے اور کام کر سکیں گے۔ عربوں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ 1914ء تک 46 ہزار صیہونی یہودی فلسطین میں داخل ہو چکے تھے اور فلسطین میں یہودیوں کی مجموعی تعداد 80 ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے ایک لاکھ ایکڑ زمین خرید لی تھی اور 44 بستیاں بسا لی تھیں۔ اس وقت فلسطین میں صیہونی مہاجروں کی آمد کے باوجود عربوں کی تعداد یہودیوں سے آٹھ گنا تھی (5,70,000)۔

جنگِ عظیم اول، شریف حسین کی غداری اور اعلان بالفور

1914ء میں جنگِ عظیم اول شروع ہو گئی تھی جس میں ایک طرف برطانیہ، فرانس، روس اور امریکہ کے ممالک تھے جبکہ دوسری طرف جرمنی، آسٹریا اور سلطنتِ عثمانیہ تھے۔ ہرزل تو 1905ء میں مر چکا تھا لیکن اب صیہونی تحریک کی قیادت مشرقی یورپ سے تعلق رکھنے والے ماہرِ علمِ کیمیا ڈاکٹر خائم وائزمین (Chaim Weizmann) کر رہے تھے۔ وائزمین نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے کئی برطانوی وزرا سے قریبی تعلقات استوار کر لیے تھے۔ جنگِ عظیم اول کے شروع ہوتے ہی وائزمین نے اپنے برطانوی وزیر دوستوں کے کان میں یہ بات ڈالنی شروع کر دی کہ سلطنتِ عثمانیہ کی شکست کے بعد فلسطین صیہونی یہودیوں کو دے دیا جائے۔

جنگِ عظیم اول کے زمانے میں حجاز کے عثمانی گورنر شریف حسین تھے جو مکہ میں ہی رہائش پذیر تھے۔ شریف حسین اقتدار کے بھوکے تھے اور جنگِ عظیم اول سے پہلے بھی سازشوں کے تانے بانے بنتے رہے تھے۔ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے شریف حسین نے اپنے بڑے بیٹے عبداللہ کو برطانوی وزیر لارڈ کِچنر (Lord Kitchener) کے پاس بھیجا۔ عبداللہ نے کچنر سے درخواست کی کہ برطانیہ شریف حسین کی قیادت میں ایک عرب ریاست بنانے میں ان کی مدد کرے۔ کچنر نے اُس وقت تو انکار کر دیا مگر جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی اس کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ اب لارڈ کچنر، جو برطانیہ کا وزیرِ جنگ بن چکا تھا، نے شریف حسین سے دوبارہ رابطے استوار کیے۔ برطانوی حکومت نے شریف حسین سے وعدہ کیا کہ اگر وہ عثمانی سلطنت کے خلاف غداری کر کے بغاوت کرے تو برطانیہ اس کو سلطنت عثمانیہ کے عرب علاقوں کا بادشاہ بنا دے گا۔

1915ء میں اس سازش پر شریف حسین اور حکومتِ برطانیہ کا اتفاق ہو گیا اور جون 1916ء میں شریف حسین نے عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانیہ نے اپنے اتحادی فرانس کو بھی "سائکس پیکو" (Sykes Picot) معاہدے کے تحت

شام اور لبنان کے عرب علاقے دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔

1917ء میں روس میں انقلاب برپا ہو گیا اور روس میں بادشاہت کو ختم کر کے اشتراکیت (Communism) نافذ کر دی گئی۔ یورپ میں اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ اشتراکیت کے نظریے کے پیچھے کوئی یہودی سازش کارفرما ہے۔ صیہونی لیڈر وائز مین نے اس افواہ کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وائز مین نے برطانوی وزرا کو یہ باور کرایا کہ روس کی اشتراکی حکومت اصل میں صیہونیوں کی ہی آلہ کار ہے اور اگر برطانیہ جنگ میں روس کے ساتھ اپنا اتحاد برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اسے فلسطین میں ایک صیہونی ریاست بنانے کا وعدہ کرنا پڑے گا۔ وائز مین کا یہ دھوکہ کامیاب رہا اور دو نومبر 1917ء کو برطانوی حکومت نے اعلان بالفور جاری کر دیا۔ آرتھر بالفور اُس وقت برطانوی وزیر خارجہ تھے اور اس اعلان میں انہوں نے فلسطین کے اندر ایک صیہونی یہودی ریاست بنانے کا وعدہ کیا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ برطانیہ نے شریف حسین، فرانس اور صیہونیوں سے مختلف وعدے تو کر لیے لیکن برطانیہ کا اصل مقصد فلسطین اور دیگر عرب علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرنا تھا۔ برطانیہ ان تینوں پارٹیوں کو جھوٹے وعدوں کے ذریعے بے وقوف بنا کر اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتا تھا۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ کیسے برطانیہ کو مجبوراً فرانس اور صیہونیوں سے کیے ہوئے وعدے پورے کرنے پڑے۔ لیکن عرب چونکہ کمزور تھے اور اپنی بات منوا نہ سکتے تھے، اس لیے برطانیہ نے ان کے مطالبات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

فلسطین میں برطانوی اقتدار

1918ء میں جنگ عظیم اول ختم ہوگئی، سلطنتِ عثمانیہ شکست کھا گئی اور فلسطین پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا۔شریف حسین سلطنت عثمانیہ کے تمام عرب علاقوں کا بادشاہ بننا چاہتا تھا لیکن غداری کے صلے میں اس کو بہت تھوڑا ہی نفع ہوا۔حجاز پر اس کی پہلے بھی حکمرانی تھی، جبکہ فلسطین، لبنان اور شام کے عرب علاقے شریف حسین کو نہ دیے گئے بلکہ برطانیہ اور فرانس نے آپس میں بانٹ لیے۔شریف حسین کے بیٹے فیصل نے شام پر فرانسیسی قبضے کے خلاف لڑنے کی کوشش کی مگر شکست کھائی اور دمشق میں فرانسیسی جنرل گورارڈ (Gourard) نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر پر اپنا بوٹ رکھ کر اعلان کیا کہ صلاح الدین جاگو! ہم واپس آگئے ہیں۔

عراق کی حکومت بھی برطانیہ نے اپنے پاس ہی رکھی اور شریف حسین کے بیٹے فیصل کو عراق کے محض کٹھ پتلی بادشاہ کا خطاب دے دیا۔موجودہ ملک اُردن کے علاقے کا امیر شریف حسین کے بیٹے عبداللہ کو بنا دیا گیا۔اس وقت یہ صحرائی علاقہ تھا اور یہاں صرف چند بدّو قبیلے رہتے تھے۔

فلسطین میں برطانیہ نے اپنی حکومت قائم کرلی اور اس کی توثیق نئی بننے والی جمعیت اقوام (League of Nations) سے کروالی۔جمعیت اقوام نے برطانیہ کو فلسطین پر حکومت کا جو مینڈیٹ (Mandate) دیا اس میں یہ واضح طور پر لکھا تھا کہ برطانوی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ مقامی عرب باشندوں کو اس قابل بنائے کہ وہ فلسطین کی حکومت کو خود سنبھال سکیں۔اس شرط کے پورا ہوتے ہی فلسطینیوں کو آزاد کردیا جانا تھا لیکن برطانوی حکومت پر صیہونیوں کے کافی گہرے اثرات تھے۔

پہلے روز سے ہی فلسطین میں برطانوی راج کے اندر عربوں کے ساتھ سخت متعصّبانہ سلوک کیا گیا اور صیہونی یہودیوں کو بے پناہ مراعات دی گئیں۔صیہونیوں کو یورپ سے آکر فلسطین میں آباد ہونے کی کھلی اجازت دی گئی۔ان کو اپنی اسمبلی، معیشت، خزانہ، مزدور تنظیمیں

اور حتیٰ کہ فوجی ملیشیا تک بنانے کی اجازت دی گئی۔ دوسری طرف فلسطینیوں کو نہ صرف ان تمام حقوق سے محروم رکھا گیا بلکہ ان کے ساتھ اور بھی بہت ساری زیادتیاں کی گئیں۔ ایک ہی درجے کی نوکری کرنے والے یہودی کی تنخواہ فلسطینی سے کئی گنا زیادہ تھی۔ سرکاری دفاتر اور پولیس وغیرہ کے محکموں میں یہودیوں کو زیادہ نوکریاں دی جاتی تھی۔ فلسطینیوں کے تعلیمی اداروں پر بھی سرکاری دباؤ ڈالا جاتا تھا۔ دوسری طرف یہودیوں کو القدس میں عبرانی یونی ورسٹی بنوا کر دی گئی۔

برطانوی حکومت کے اِن ہتھکنڈوں کی وجہ سے فلسطینی جلد ہی اُس سے متنفر ہو گئے۔ فلسطینی عوام برطانوی حکومت اور صیہونیوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے فلسطینی اشرافیہ کو دولت اور مراعات کے ذریعے سے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ یہ اشرافیہ برطانوی حکومت کے لیے آزادیِ فلسطین کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کا کام کرتی تھی۔

یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ فلسطینیوں نے یہودیوں کو فلسطین کی زمین بیچی اور اس وجہ سے فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ بات صریح جھوٹ ہے۔ یہودیوں نے فلسطین کی (2.5) فی صد زمین خریدی، جبکہ تقریباً 4 فی صد مزید زمین برطانوی حکومت نے ان کو سرکاری طور پر الاٹ کر دی۔ اس ڈھائی فی صد زمین کا بھی 90 فی صد حصہ فلسطینی اشرافیہ کے چند گنے چنے خاندانوں نے یہودیوں کو بیچا۔ فلسطینی اشرافیہ نے زمین بیچنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں سے یہ بات بھی طے کی تھی کہ وہ خود اپنی زمینوں کو فلسطینی عرب مزارعوں سے خالی کروا کر دیں گے تاکہ یہودی اس خالی زمین پر آبادکاری کر سکیں۔ اس طرح فلسطینی اشرافیہ کے چند خاندانوں نے چند ٹکوں کے عوض فلسطینی عوام کے گلے میں برطانوی سامراج اور صیہونی استعمار کی زنجیر ڈال دی۔

فلسطینیوں کی جدوجہدِ آزادی کا آغاز

حماس کے عسکری ونگ کو" عزالدین القسام بریگیڈ" کہا جاتا ہے۔عزالدین القسام ایک عالمِ دین، مصلح اور فلسطین کی جدوجہدِ آزادی کے بانی تھے۔القسام شام سے ہجرت کرکے فلسطین آئے تھے اور انہوں نے فلسطینی مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے بہت خدمات سرانجام دی تھیں۔ 1930ء کی دہائی میں القسام اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ برطانیہ اور صیہونیت کو صرف مسلح جہاد کے ذریعے ہی شکست دی جاسکتی ہے۔ فلسطینی اشرافیہ نے ان کے ساتھ تعاون کرنے سے صاف انکار کردیا مگر القسام نے ہمت نہ ہاری۔انہوں نے اپنے بل بوتے پر ایک چھوٹی سی عسکری تنظیم بنائی اور جہاد کا آغاز کردیا۔برطانوی حکومت نے القسام کو سختی سے کچلنے کا فیصلہ کیا۔نومبر 1935 میں برطانوی سپاہیوں نے القسام اور ان کے چند ساتھیوں کو گھیرے میں لے لیا۔القسام نے ہتھیار پھینکنے پر شہادت کی موت کو ترجیح دی اور بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

1935 میں ہی ایک اور دلچسپ واقعہ رونما ہوا جس نے صیہونی تحریک کے اصل عزائم واضح کردیے۔جافہ کی بندرگاہ میں سیمنٹ کے صندوق جہازوں سے اتارتے وقت ایک صندوق مزدور کے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ گیا۔ فلسطینی مزدور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس صندوق میں سے سیمنٹ کے بجائے اسلحہ برآمد ہوا۔اس جہاز پر ایک اسرائیلی تاجر کے 537 صندوق تھے۔ان میں سے 360 صندوقوں میں سے اسلحہ برآمد ہوا۔ 25 مشین گنیں، 800 بندوقیں اور چار لاکھ گولیاں برآمد ہوئیں۔اس واقعہ سے فلسطینیوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ صیہونی یہودی اسلحہ جمع کررہے ہیں تاکہ موقع ملتے ہی وہ فلسطینیوں کا فلسطین سے صفایا کرسکیں۔اس واقعے اور القسام کی شہادت نے فلسطینیوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کردیا۔ 1936 میں فلسطینیوں نے برطانوی راج کے خلاف بغاوت کردی، جو تین سال تک جاری رہی۔

جنگ عظیم اول اور دوم کے درمیانی عرصے میں برطانیہ کے لیے یہ جنگ سب سے زیادہ خونریز جنگ ثابت ہوئی۔اس وقت ہٹلر کا جرمنی یورپ میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھر رہا

تھا۔ برطانیہ اپنی توجہ جرمنی کی طرف رکھنا چاہتا تھا اور اس لیے اس نے کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ صیہونی یہودیوں کو فوجی تربیت دے کر فلسطینی باغیوں کے خلاف استعمال کیا جائے۔ صیہونیوں کے لیے" آم کے آم گٹھلیوں کے دام" کی سی کیفیت بن گئی ۔ ایک طرف ان کو فلسطینیوں کی نسل کشی (Genocide) شروع کرنے کا موقع مل گیا۔ جبکہ دوسری طرف برطانوی حکومت بھی ان کی احسان مند ہوگئی۔ فلسطینی بغاوت کو برطانیہ اور صیہونیوں نے بڑی بے رحمی سے کچل دیا۔ فلسطینی عربوں کی کل مردانہ آبادی کا 10 فی صد یا تو مار ڈالا گیا یا زخمی کر دیا گیا یا پھر قید کر دیا گیا۔ ہزاروں فلسطینی خاندانوں کے گھر مسمار کر دیے گئے۔ اس بغاوت میں فلسطینیوں کا اس قدر نقصان ہوا کہ 10 سال بعد جب اسرائیل نے" نکبہ" برپا کیا تو فلسطینی قحط الرجال کا سامنا کر رہے تھے۔

جنگِ عظیم دوم اور ہولوکاسٹ

1939ء میں جنگ عظیم دوم شروع ہوگئی۔ جرمنی کا حکمران ہٹلر یہودیوں کا سخت مخالف تھا اور اس نے لاکھوں یورپی یہودی مروا دیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہٹلر کے اس ظالمانہ اقدام کوصیہونیوں اور ان کے امریکی و برطانوی حمائیتیوں کی بالواسطہ حمایت حاصل رہی۔صیہونیوں نے صاف واضح کر دیا کہ پورے یورپ سے اگر یہودیوں کو بچانے کے لیے نکالا جاتا ہے تو ان کو صرف اور صرف فلسطین میں ہی آباد کیا جائے۔صیہونیوں کی اس ضد کی وجہ سے لاکھوں یہودی، جو بچائے جا سکتے تھے،لقمہِ اجل بن گئے۔ صیہونی تحریک نے اس طرح یہ واضح کر دیا کہ وہ اپنے سیاسی مفادات کو یہودیوں کی جانوں پر ترجیح دیتی ہے۔آج تک صیہونیوں کی یہی پالیسی ہے۔

1945ء میں جنگ عظیم دوم ختم ہوگئی۔ کچھ اندازوں کے مطابق ہٹلر کی حکومت نے 60 لاکھ یہودی مار ڈالے۔ اس ظلم کو صیہونیوں نے اپنے سیاسی مفادات کے لیے بھرپور طور پر استعمال کیا۔صیہونوں کا یہ مطالبہ تھا کہ ہٹلر کے ستائے ہوئے یہودیوں کے لیے اب واحد پناہ گاہ فلسطین میں بننے والی ایک صیہونی یہودی ریاست ہی ہوسکتی ہے۔ برطانیہ چاہتا تھا کہ کسی طرح فلسطین پر اپنا اقتدار ہی برقرار رکھ لے۔ اس لیے اب اس نے صیہونی ریاست کے مطالبے پر سرد مہری دکھائی۔ مگر صیہونی تحریک اس کے لیے تیار تھی۔صیہونی قائدین خائم وائز مین اور ڈیوڈ بن گوریان (David Ben Gurion) کو اس بات کا اندازہ تھا کہ اب صیہونی تحریک کو برطانیہ کی زیادہ پشت پناہی میسر نہ ہو سکے گی۔ جنگ عظیم دوم کے دوران میں ہی صیہونی تحریک نے امریکی حکومت اور کانگرس سے قریبی تعلقات استوار کر لیے تھے۔ جب جنگ عظیم دوم ختم ہوئی تو امریکہ صیہونی ریاست کے مطالبے کی حمایت میں پورے طریقے سے سامنے آ گیا۔ امریکی صدر روز ویلٹ (Roosevelt) جنگ عظیم دوم کے خاتمے سے چند ماہ پہلے سعودی فرماں روا شاہ عبدالعزیز ابن سعود سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ وہ فلسطین میں صیہونی ریاست کے قیام کی حمایت کریں۔شاہ عبدالعزیز نے روز ویلٹ سے ایک دلچسپ مکالمہ کیا:

شاہ عبدالعزیز: "جنابِ صدر! آپ فلسطین میں یہودی ریاست کی حمایت کیوں کر رہے ہیں؟"
روز ویلٹ: "جناب! ہٹلر نے یہودیوں پر بہت ظلم کیے ہیں۔ لاکھوں کو مارا ہے۔ اب ان کی اشک شوئی کے لیے ہمیں اتنا تو کر دینا چاہیے کہ ان کو ایک ریاست ہی بنا دیں"۔
شاہ عبدالعزیز: "صحیح فرما رہے ہیں آپ۔ یہودیوں پر یہ ظلم کس نے کیے ہیں؟ جرمنوں نے؟"
روز ویلٹ: "جی ہاں!"
شاہ عبدالعزیز: "تو پھر انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ مظلوم یہودیوں کو اشک شوئی کے لیے انہی ظالم جرمنوں کے علاقے اور گھر دیے جائیں جو اُن کے مصائب کے ذمہ دار ہیں۔ بیچارے فلسطینیوں نے کیا قصور کیا ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ ظلم جرمنی کرے اور بھگتیں فلسطینی"۔

روز ویلٹ لاجواب ہو گئے اور اس واقعہ کے بعد ان کی طرف سے صیہونی ریاست کے مطالبے کی حمایت میں کمی بھی دیکھنے کو ملی۔ لیکن تین ماہ بعد ہی روز ویلٹ کا انتقال ہو گیا اور ہیری ٹرومین نئے امریکی صدر بن گئے۔ روز ویلٹ کے برعکس ٹرومین ایک قدآور سیاسی رہنما نہ تھے۔ وہ اپنی سیاست کے لیے امریکہ کی طاقتور یہودی لابی کی حمایت کے محتاج تھے۔ لہٰذا انہوں نے صیہونی ریاست کی تحریک کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی۔

اسرائیل کی ناجائز ریاست
کا قیام بذریعہ اقوامِ متحدہ

1945ء میں جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے بعد اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔اُس وقت دنیامیں کم و بیش 40 سے 50 ملک ہی آزاد تھے۔ان میں سے بہت سارے ممالک لاطینی امریکہ میں اور چند افریقہ میں تھے جو کہ انتہائی کمزور ممالک تھے۔

اقوامِ متحدہ میں اصل طاقت امریکہ اور روس کے ہاتھ میں تھی۔ابتدا میں اقوامِ متحدہ کو درپیش چند اولین مسائل میں سے سب سے بڑا مسئلہ فلسطین کا مسئلہ تھا۔اس معاملے میں اقوام متحدہ نے اپنے جس گھناؤنے روپ کا اظہار کیا اس نے اس تنظیم کی شہرت کو شروع میں ہی داغدار کر دیا۔

1945ء میں جنگ عظیم دوم کے بعد عرب چاہتے تھے کہ فلسطین کو جلد از جلد آزاد کر دیا جائے۔برطانوی راج میں برطانوی حمایت سے صیہونیوں کی ایک بہت بڑی تعداد فلسطین میں آباد ہوئی تھی۔لیکن اس کے باوجود بھی ان کا تناسب 20 سے 25 فی صد سے زیادہ بڑھ نہ پایا تھا۔صیہونی چاہتے تھے کہ کہ کسی طرح مزید یہودیوں کو فلسطین میں لاکر آباد کر کے فلسطین میں یہودیوں کی اکثریت پیدا کر لی جائے۔

امریکی صدر ٹرومین نے یہ اعلان کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ایک لاکھ یہودیوں کو فوراً فلسطین میں آباد کیا جائے۔اس پر برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے یہ کہا کہ اگر ہم ایک لاکھ یہودی آباد کر بھی دیں تب بھی صیہونیوں کی خواہش اس سے پوری نہ ہو گی۔ وہ اس کے بعد اور بڑے مطالبے کریں گے۔بیون کا یہ بھی کہنا تھا کہ برطانیہ فلسطین کے اندر عربوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی صریح زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔" دیر آید درست آید" والا معاملہ نہ تھا بلکہ برطانیہ کو نظر آ رہا تھا کہ صیہونیوں کے بجائے اگر وہ اس وقت عربوں کا ساتھ دے تو اس کو زیادہ فائدہ ہوگا۔عربوں کے اکثر حکمران برطانیہ کے کٹھ پتلی حکمران تھے۔آیا کہ وہ مصر ہو یا اردن، برطانیہ کو ان پر کافی اثر و رسوخ حاصل تھا۔برطانیہ اس وقت چاہ رہا تھا کہ وہ

فلسطین پر کسی طرح اپنا اقتدار ہی برقرار رکھے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس کو عربوں اور عرب حکمرانوں کی ضرورت تھی۔

چنانچہ برطانیہ نے اب یہ موقف اختیار کیا کہ وہ مزید یہودیوں کو فلسطین میں آباد نہیں کرنا چاہتا لیکن امریکہ نے اس موقف کی سخت مخالفت کی۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد برطانیہ صف اول کی طاقت نہیں رہا تھا، جبکہ امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر سامنے آچکا تھا۔ اس لیے برطانیہ کو امریکہ کے آگے اپنا موٴقف چھوڑنا پڑا اور امریکہ کی بات ماننی پڑی، جس کے نتیجے میں ایک لاکھ یہودیوں کو جنگ عظیم دوم کے بعد جلدی سے فلسطین میں لایا گیا۔ اس کے باوجود بھی فلسطین میں یہودیوں کی کل تعداد 35 فیصد سے بڑھ نہ پائی۔ عربوں کا مطالبہ یہ تھا کہ فلسطین کو جلد از جلد ایک اکائی کی صورت میں ہی آزاد کر دیا جائے اور اسے تقسیم نہ کیا جائے۔ جبکہ یہودیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ پورے فلسطین کے اندر ایک صیہونی ریاست قائم کی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم فلسطین کے ایک حصے میں صیہونی ریاست لازماً قائم کی جائے۔

یہودی تقسیم کی وکالت تو کر رہے تھے مگر حقیقت میں فلسطین کے کسی ایک ضلع میں بھی یہودیوں کی اکثریت نہ تھی۔ یہاں پر ٹرومین اور صیہونیوں نے ایک انوکھا فارمولا ترتیب دیا جس کے مطابق انہوں نے تقسیم کے منصوبے کی وکالت شروع کر دی اور کہا کہ تقسیم اس طرح ہو کہ جن اضلاع میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب زیادہ ہے، چاہے وہاں یہودی اکثریت میں نہ بھی ہوں، وہ اضلاع یہودیوں کو دے دیے جائیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ ایک ضلع کے اندر یہودی 15 فی صد ہیں اور دوسرے ضلع کے اندر 30 فی صد ہیں تو 30 فی صد یہودی آبادی والے ضلع کو اسرائیل کی صیہونی ریاست میں شامل کر دیا جائے۔ اس طرح صیہونی ریاست کا ایک خاکہ تشکیل دیا گیا۔ بے ایمانی کا یہ عالم تھا کہ اس غیر منطقی فارمولے میں بھی گڑبڑ کی گئی، جیسے النقب (Negev) کا صحرا، جس کے اندر یہودیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، کو بھی ٹرومین کے حکم سے اسرائیل کی صیہونی ریاست کو دے دیا گیا۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ صیہونیوں کے رہنما ڈاکٹر خائم وائز مین ٹرومین سے ملے اور انہوں نے کہا کہ النقب (Negev) کے صحرا سے یہودیوں کی تاریخی وابستگی ہے، اس لیے

ٹرومین اس بات کو یقینی بنائیں کہ یہ صحرا بھی اسرائیل کی ریاست کا حصہ ہو۔ درحقیقت وجہ تاریخی نہ تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی النقب (Negev) کا صحرا اگر اسرائیل کی ریاست میں شامل ہو جاتا تو مصر اور اردن کے درمیان براہ راست کسی بھی طرح کا زمینی راستہ باقی نہ رہتا۔ اسرائیل ایک خنجر کی صورت میں عرب دنیا کے دل میں اتارا جانے والا تھا اور اس خنجر کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ یہ عرب دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے درپے تھا۔ اسرائیل یہ چاہتا تھا کہ ایشیا کے عربوں اور افریقہ کے عربوں کے درمیان اسرائیلی ریاست ایک ناسور کی طرح پیوست ہو جائے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اسرائیل النقب (Negev) کا صحرا ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اقوام متحدہ میں فلسطین کے معاملے پر اس سوال کے متعلق ووٹنگ کرائی گئی کہ فلسطین کو ایک ہی متحدہ ریاست کے طور پر آزاد کیا جائے، جس میں عربوں کو 66 فی صد اکثریت حاصل ہو، یا فلسطین کے دو ٹکڑے کر کے ایک عرب اور ایک اسرائیلی ریاست بنائی جائے۔ اس ووٹنگ کے دوران میں بھی امریکہ نے بے ایمانی کا دامن نہ چھوڑا اور دیگر ممالک پر بے پناہ دباؤ ڈالا۔ لاطینی امریکہ کے کمزور ممالک کو طرح طرح کی دھمکیاں دے کر اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اسرائیل کے حق میں ووٹ دیں۔ اس طرح نومبر 1947 میں اقوام متحدہ کی اکثریت نے اسرائیل ریاست کے قیام کی منظوری میں ووٹ دیا۔

ابھی بھی بعض لوگ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ عربوں نے بڑی غلطی کی کہ اس تقسیم کو نہیں مانا اور اگر وہ 1947 کی اس تقسیم کو مان لیتے تو فلسطین کی کم از کم ایک ریاست تو معرض وجود میں آجاتی۔

یہ بات صریحاً غلط ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ فلسطین کی جو ریاست اقوام متحدہ کے اس منصوبے میں پیش کی گئی تھی وہ عملی طور پر قیام پذیر اور مستحکم ریاست نہ تھی۔ اس منصوبے کے مطابق فلسطینی ریاست تین ٹکڑوں پر مشتمل تھی اور ان ٹکڑوں کے مابین کوئی زمینی رابطہ موجود نہ تھا۔ جبکہ اسرائیلی ریاست کے تمام حصے آپس میں ملحق تھے۔ اگر تقسیم کے اس منصوبے پر من و عن عمل ہو بھی جاتا تو فلسطینی ریاست تین مختلف ٹکڑوں کی صورت میں معرض وجود میں آتی۔

دوسری بات یہ تھی کہ اسرائیلی قیادت نے پہلے دن سے یہ واضح کر دیا تھا کہ تقسیم تو اُن کا صرف پہلا قدم ہے۔ صیہونیت کی تحریک کا مقصد پہلے دن سے ہی پورے ارضِ فلسطین پر قابض ہونا تھا۔ 1946 میں ڈیوڈ بن گوریان نے ، جو کہ اسرائیل کا پہلا وزیرِ اعظم بھی بنا، صیہونیوں کا ایک بڑا اجلاس بلایا تھا جس میں صیہونیوں کی تمام جماعتوں کے اراکین شریک تھے۔ اس اجلاس میں بن گوریان نے ایک نقشے کے ذریعے دکھایا تھا کہ ارضِ فلسطین، جو کہ دریائے اردن اور بحیرہ روم (Mediterranean Sea) کے درمیان واقع ہے، کے 80 فی صد علاقے پر اسرائیل کی ریاست قائم ہوگی اور باقی 20 فی صد علاقہ فلسطینیوں کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔ بن گوریان نے اس اجلاس میں یہ بھی بتایا کہ 20 فی صد علاقہ چھوڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ علاقہ ہم فلسطینیوں کو دینا چاہتے ہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ یہودیوں کی تعداد فی الوقت اتنی کم ہے کہ وہ پورے فلسطین پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ بن گوریان نے کہا کہ ہمارا مقصد ابھی یہ ہے کہ ہم اس 80 فی صد علاقے میں فلسطینیوں کی نسل کشی (Genocide) کر کے ان میں سے کچھ کو مار دیں اور باقیوں کو دھکیل دھکال کر اس 20 فی صد علاقے میں جمع کر دیں، تاکہ باقی 80 فی صد علاقہ ہمارے قبضے میں آ جائے۔ پھر جب ہماری تعداد زیادہ ہو جائے گی تو ہم اپنی مرضی کے مطابق باقی 20 فی صد علاقے پر بھی قبضہ کر لیں گے۔

پس بنیادی طور پر حقیقی بات یہ ہے کہ اسرائیل 1947 کی تقسیم کے منصوبے کو قبول کرنے کا ارادہ شروع ہی سے نہیں رکھتا تھا اور آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ نکبہ کے اندر اسرائیل نے خود اقوامِ متحدہ کے اس منصوبے کو بظاہر تو قبول کر لیا لیکن عملاً اس نے اس منصوبے کی دھجیاں اڑا دیں اور فلسطینی علاقوں پر پہلے دن ہی سے قبضے کا سلسلہ جاری رکھا۔

نکبہ اور پہلی عرب اسرائیل جنگ

عربی زبان میں نکبہ کے معنی" بہت بڑی مصیبت" کے ہیں۔ جب صیہونیوں نے فلسطینیوں کی نسل کشی (Genocide) کی تو فلسطینیوں نے اس کو نکبہ کا نام دیا۔ 1947 اور 1948 کے سالوں میں صیہونیوں نے ایک منظم طریقے سے فلسطینیوں کی نسل کشی (Genocide) کر کے فلسطین کے 80 فی صد حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس علاقے میں، جہاں اسرائیل کی ناجائز ریاست قائم ہوئی، آٹھ لاکھ فلسطینی رہتے تھے۔ 1948 کے آخر میں جب نسل کشی (Genocide) کا یہ طوفان بالآخر تھما تو اس علاقے میں ڈیڑھ لاکھ فلسطینی ہی باقی بچے۔ ساڑھے چھے لاکھ فلسطینیوں کو یا تو مار ڈالا گیا یا پھر بے گھر کر کے پناہ گزین بننے پر مجبور کر دیا گیا۔ اقوام متحدہ کے مطابق پانچ کام ایسے ہیں جن میں سے ایک کا بھی ارتکاب کیا جائے تو اس عمل کو نسل کشی (Genocide) کہا جائے گا۔ یہ کام درج ذیل ہیں:

1: مظلوم قوم کے افراد کو بڑی تعداد میں قتل کرنا۔

2: مظلوم قوم کے افراد کی ایک بڑی تعداد کو جسمانی یا ذہنی نقصان پہنچانا۔

3: ایسے حالات پیدا کر دینا کہ مظلوم قوم اپنے علاقے سے مکمل یا جزوی طور پر تلف ہو جائے۔

4: کوشش کرنا کہ مظلوم قوم میں نئے بچوں کی پیدائش نہ ہو، تاکہ اس کی کوئی نوجوان نسل پیدا ہی نہ ہو سکے۔

5: مظلوم قوم کے بچوں کو اغوا کر کے کسی اور قوم کے حوالے کر دینا، تاکہ مظلوم قوم کی نوجوان نسل ختم ہو جائے۔

اگر ہم غیر جانبدارانہ نگاہ اپنائیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسرائیل نے نسل کشی (Genocide) کے لیے نہایت ہی منظم طریقے سے ان پانچ میں سے چار افعال کا ارتکاب کیا ہے۔ 48۔ 1947 کے زمانے میں صیہونی یہودیوں کے پاس فلسطین میں ایک باقاعدہ فوج موجود تھی۔ ان کی تین عسکری تنظیمیں تھیں۔ سب سے بڑی تنظیم کا نام" ہگنا"

(Haganah) تھا، جو بعد میں اسرائیلی فوج میں تبدیل ہوگئی۔ اس میں 40 ہزار کے قریب تربیت یافتہ سپاہی موجود تھے، جن کو 12 بریگیڈز میں منظم کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ارگن (Irgun) اور لیہی (Lehi) کی دہشت گرد تنظیمیں بھی موجود تھیں، جن کو صیہونی قیادت نفسیاتی جنگ اور خوفناک دہشت گردی کی کارروائیوں کے لیے استعمال کرتی تھی۔ یہاں پر یہ بات بتانا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ارض فلسطین میں دہشت گردی اور بم دھماکوں کا آغاز بھی صیہونیوں نے ہی کیا تھا۔

جنگ عظیم دوم کے بعد جب برطانیہ نے صیہونی ریاست کی حمایت ترک کر دی تو صیہونی دہشت گرد تنظیموں نے برطانوی لوگوں اور عربوں پر کئی دہشت گرد حملے اور بم دھماکے کیے تھے، جن میں سینکڑوں لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ آج فلسطینیوں کو دہشت گرد کا لیبل لگانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ارض فلسطین میں دہشت گردی کی بنیاد بھی صیہونیوں نے ہی رکھی تھی۔

اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان کی قیادت میں صیہونیوں کا نسل کشی (Genocide) کا پلان یہ تھا کہ ہر بریگیڈ کو ایک خاص گاؤں، علاقہ یا قصبہ دیا گیا تھا۔ ہر بریگیڈ نے اپنے ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے زبردستی ان علاقوں کو فلسطینی آبادی سے خالی کرانا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں اسرائیل نے ایک طرف اقوام متحدہ کے تقسیم کے منصوبے کو منظور کرنے کی ہامی بھری تھی، وہیں دوسری طرف ڈیوڈ بن گوریان کے اس ماسٹر پلان، جس کو پلان ڈالیٹ (Plan-D) کہا گیا، میں بہت سارے وہ علاقے بھی شامل تھے جو کہ اقوام متحدہ نے فلسطینی ریاست کو الاٹ کیے تھے۔ یعنی کہ ایک طرف تو بن گوریان دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے اقوام متحدہ کا تقسیم کا منصوبہ منظور کر رہے تھے، جبکہ دوسری طرف وہ اسی منصوبے کے تحت فلسطینیوں کو الاٹ کیے گئے علاقوں میں نسل کشی (Genocide) کا طوفان بھی برپا کیے ہوئے تھے۔

صیہونیوں نے نکبہ کے دوران نفسیاتی جنگ کے حربوں کو بھی بھرپور طور پر استعمال کیا۔ ان کا سب سے مؤثر نفسیاتی حربہ یہ تھا کہ وہ ایک علاقے کے کسی مرکزی گاؤں یا قصبے میں گھس کر

اس میں خوفناک قتل عام کرتے، خواتین کی عصمت دری کرتے، بچوں کو بھی نہ چھوڑتے اور لاشوں تک کی بے حرمتی کرتے۔ اس قدر خوفناک قسم کے قتل عام کے بعد ان کے سپاہی ارد گرد کے گاؤں میں اعلان کرتے اور بتاتے کہ اگر تم ان علاقوں کو خالی نہیں کرتے تو تمہارے گھروں اور خاندانوں کا بھی یہی حشر کیا جائے گا۔

فلسطینی عربوں کے پاس کوئی ایسی فوج نہ تھی جو ان کا تحفظ کرتی۔ نتیجے کے طور پر خوف کے مارے ہوئے فلسطینی اپنے گھروں سے اس امید پر نکل پڑتے کہ جب امن قائم ہوگا تو وہ واپس آئیں گے لیکن اسرائیل نے آج تک ان پناہ گزینوں کو اپنے گھروں میں واپس آنے کی اجازت نہیں دی۔

اپریل 1948 میں اسرائیلی نسل کشی (Genocide) نے اپنی خوفناک ترین شکل اختیار کر لی۔ دیر یاسین کا مشہور زمانہ قتل عام (Deir Yassin Massacre) بھی اپریل 1948 ہی میں پیش آیا۔ اپریل اور مئی کے مہینوں میں تقریباً تمام بڑے فلسطینی شہروں کو فلسطینیوں سے خالی کرا دیا گیا۔ حیفہ سے 60 ہزار، مغربی القدس سے 30 ہزار، صفد سے 12 ہزار، بیسان سے 6 ہزار اور طبریا سے ساڑھے 5 ہزار فلسطینیوں کو نکال کر پناہ گزین بننے پر مجبور کر دیا گیا۔

14 مئی 1948 کو جب ناجائز اسرائیلی ریاست نے اپنے قیام کا اعلان کیا تو اس وقت تک چار لاکھ سے زائد فلسطینیوں کو نسل کشی (Genocide) کے ذریعے فلسطین سے نکالا جا چکا تھا۔ 15 مئی 1948 کو پانچ عرب ممالک کی فوجوں نے فلسطینیوں سے یکجہتی میں اسرائیل کی ناجائز ریاست پر حملہ کر دیا۔ یہاں سے نکبہ کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا، جسے پہلی عرب اسرائیل جنگ بھی کہتے ہیں۔

پہلی عرب اسرائیل جنگ کے متعلق صیہونیوں نے بہت سارے افسانے گھڑے، جن میں سے کچھ آج بھی کافی مشہور ہیں۔ سب سے بڑا افسانہ یہ تھا کہ چھوٹی سی اسرائیل کی صیہونی ریاست پر پانچ بڑے بڑے عرب ممالک کی بھاری بھرکم فوجوں نے حملہ کر دیا۔ اسرائیلیوں کے مطابق یہ ننھے سے داؤد اور قوی ہیکل جالوت کے درمیان ایک نئی کشمکش تھی۔ لیکن اب مؤرخ

لکھتے ہیں کہ اگر یہ جالوت اور داؤد کی کشمکش ہی تھی تو اس میں ننھا داؤد عرب تھے اور بھاری بھرکم جالوت صیہونی تھے۔ اگر ہم صرف فوج کی تعداد ہی دیکھ لیں تو مئی 1948 میں صیہونی فوج کی تعداد 40 ہزار سے زیادہ تھی، جبکہ پانچ عرب ممالک کی مجموعی فوجی تعداد 30 ہزار کے لگ بھگ تھی جس میں تقریباً 10 ہزار مصری، ساڑھے 4 ہزار اردنی، 7 ہزار شامی 8 ہزار عراقی اور تین ہزار لبنانی فوجی شامل تھے۔ 5 حصوں میں تقسیم یہ فوج آپس میں کسی بھی قسم کے نظم وضبط اور ربط سے عاری تھی جبکہ اسرائیلی فوج مکمل طور پر متحد اور منظم تھی۔ لبنان، شام اور عراق کی فوجوں نے اس جنگ میں برائے نام ہی حصہ لیا۔ اس لیے ان کو بھی زیادہ تر خارج از بحث ہی سمجھا گیا ہے۔

جہاں تک بات ہے اردن اور مصر کی تو اردن کے بادشاہ اس وقت شریف حسین کے بیٹے شاہ عبداللہ تھے، جنہوں نے پہلی جنگ عظیم میں عثمانی سلطنت سے غداری کی تھی۔ شاہ عبداللہ نے اپنے باپ کی طرح غدار ہونے کا ثبوت دیا اور غدار ابن غدار کا لقب حاصل کیا۔ نکبہ سے پہلے ہی انہوں نے صیہونی قیادت کے ساتھ خفیہ رابطے قائم کر رکھے تھے اور ایک خفیہ معاہدہ بھی کر رکھا تھا جس کے مطابق انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر مغربی کنارہ (West Bank) صیہونی ان کے لیے چھوڑ دیں تو باقی سارے فلسطین میں ان کی طرف سے صیہونی کارروائیوں کی مزاحمت نہ کی جائے گی۔ اردن کی فوج عربوں کی دیگر افواج کے مقابلے میں بہتر اسلحے سے لیس اور بہتر تربیت یافتہ تھی۔ فلسطینی عربوں کی زیادہ تر امیدیں اسی فوج سے وابستہ تھیں کہ یہ فوج عربوں کا ہراول دستہ ثابت ہو کر اسرائیل کی صیہونی قوت کو تہس نہس کر سکتی ہے لیکن شاہ عبداللہ نے جنگ سے پہلے ہی در پردہ میچ فکس کر رکھا تھا۔ عبداللہ کی یہ شرائط صیہونیوں کو بھی پسند آئیں کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ صیہونیوں کا پہلے ہی ارادہ یہ تھا کہ 80 فی صد فلسطین پر قبضہ کیا جائے اور چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھوڑ دیے جائیں تا کہ ان میں فلسطینی پناہ گزینوں کو پھینکا جا سکے۔

اس ڈیل کے مطابق شاہ عبداللہ نے پہلی عرب اسرائیل جنگ میں صیہونیوں کے خلاف کسی طرح کی بڑی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا اور مصری فوج کو صیہونیوں کے مقابلے میں تنہا چھوڑ دیا۔ شاہ عبداللہ نے صرف مغربی کنارے اور مشرقی القدس کے علاقے پر قبضہ کرنے پر اکتفا کیا اور اس کے بعد جنگ میں کوئی حصہ نہ لیا۔

مصر کے بادشاہ شاہ فاروق بھی شاہ عبداللہ کی طرح برطانیہ کے ایک ذہنی غلام اور کٹھ پتلی بادشاہ تھے۔ فلسطین میں فوج انہوں نے فلسطینیوں کی مدد کے لیے نہیں بھیجی تھی بلکہ اس لیے بھیجی تھی کہ ان کے سیاسی حریف شاہ عبداللہ فلسطین میں بہت زیادہ قوت حاصل نہ کرلیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی عوام سے بھی کچھ خوف زدہ تھے کیونکہ مصری عوام بہت پرزور طریقے سے اصرار کررہی تھی کہ فلسطین کی مدد کے لیے فوج بھیجی جائے۔ چنانچہ فوج تو انہوں نے بھیج دی مگر فوج بھیجنے کے بعد کافی حد تک فوج کو بے یارومددگار ہی چھوڑ دیا گیا اور اس کو اسلحہ اور کمک فراہم نہ کی گئی۔ نتیجتاً مصری فوجوں کو بھی اسرائیلی فوجوں نے باآسانی شکست دے دی اور غزہ کی پٹی کے علاوہ فلسطین کا تمام مغربی علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔

پہلی عرب اسرائیل جنگ میں عرب فوجوں کی شکست کے ساتھ ساتھ فلسطینیوں کی نسل کشی (Genocide) کا کام بھی جاری رہا۔ ساڑھے تین لاکھ مزید فلسطینی عربوں کو یا تو مار ڈالا گیا یا پھر گھروں سے بے دخل کردیا گیا۔ 1948 کے آخر میں جب جنگ بندی ہوئی تو فلسطین کے 80 فی صد حصے پر اسرائیل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مغربی کنارے کو اسرائیل نے شاہ عبداللہ کی غداری کے صلے میں ان کے لیے چھوڑ دیا، جبکہ غزہ کی پٹی مصر کے زیر اقتدار چلی گئی۔

اقوام متحدہ نے جس فلسطینی ریاست کو بنانے کی بات کی تھی وہ تو بنی ہی نہیں، لیکن اسرائیل کی ناجائز ریاست بن بھی گئی اور اس کو اقوام متحدہ نے تسلیم بھی کرلیا۔ امریکہ کے دباؤ کی بدولت اقوام متحدہ کا فلسطین کی ریاست کو بنانے کا وعدہ سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔

پہلی عرب اسرائیل جنگ اور پہلی صلیبی جنگ (1099ء) میں چند مماثلتیں ہیں۔ دونوں جنگوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور کفار نے مقامی آبادی کی نسل کشی (Genocide) کی۔ پہلی صلیبی جنگ میں جب صلیبیوں نے ارض فلسطین پر قبضہ کیا تو مسلمانوں کے اقتدار میں یہاں تینوں ابراہیمی مذاہب (یہودی، عیسائی، مسلمان) کے پیروکار امن اور چین سے رہ رہے تھے، جبکہ صلیبیوں نے یہودیوں اور مسلمانوں کی نسل کشی (Genocide) کی تھی۔ اس دفعہ صیہونی یہودیوں نے فلسطینی عیسائیوں اور مسلمانوں کی نسل کشی (Genocide) کرڈالی۔

دونوں جنگوں میں شکست کی وجہ یہی تھی کہ مسلمان حکمران اپنے ذاتی مفادات میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے جبکہ فلسطین اور القدس کے دفاع میں کم۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان تھا جس کے سبب انہیں شکست فاش ہوئی۔

نکبہ کے بعد

(1967-1949)

فلسطین میں ناجائز صیہونی اسرائیلی ریاست کے قیام اور فلسطینیوں کی نسل کشی (Genocide) نے عرب دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مصر، اردن، عراق اور شام کی مغرب نواز کٹھ پتلی حکومتیں شدید عوامی دباؤ میں آ گئیں۔ اردن کے شاہ عبداللہ کو غداری کا یہ صلہ ملا کہ ایک فلسطینی نوجوان نے 1949 میں ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے باوجود اردن میں شریف حسین کے خاندان کی بادشاہی مغربی حکومتوں، خاص کر امریکہ کے تعاون کی بدولت قائم رہی اور آج تک قائم ہے۔ لیکن باقی عرب ممالک میں 1950 کی دہائی کے دوران میں حکومتوں کی تبدیلی کے بہت سے واقعات رونما ہوئے۔

1952 میں مصر میں اخوان المسلمین اور مصری فوج کے باہمی تعاون سے انقلاب برپا ہو گیا۔ شاہ فاروق معزول کر دیے گئے اور جمال عبدالناصر مصر کے رہنما بن کر ابھرے۔ کہنے کو تو مصر کے صدر جنرل نجیب تھے جنہوں نے 1948 کی عرب اسرائیل جنگ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے، لیکن حکومت میں اصل طوطی کرنل جمال عبدالناصر کا بولتا تھا۔ جمال عبدالناصر ایک سیکولر ذہن کے آدمی تھے اور اسلامی قومیت کے نظریے پر عرب قومیت کے نظریے کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی سبب اخوان المسلمین اور جنرل نجیب سے اُن کے جلد ہی اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔

1954 میں جمال عبدالناصر نے جنرل نجیب کو معزول کر دیا، اخوان المسلمین پر پابندی لگا دی اور اخوان المسلمین کے سربراہان اور کارکنان پر شدید مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ جمال عبدالناصر نے یہ واضح کر دیا کہ اب مصر میں عرب قومیت کی بنا پر ہی فلسطین کا مقدمہ لڑا جائے گا۔ جمال عبدالناصر ایک بہت مسحور کن شخصیت کے مالک اور ایک بے پایاں مقرر تھے۔ مصر کے شہری متوسط طبقے کی اکثریت اُن کے سحر میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن مصر کی عوام کی اکثریت دیہی علاقوں میں آباد تھی اور عوام کا یہ نسبتاً بڑا حصہ جمال عبدالناصر کی بہ نسبت اخوان المسلمین اور اُن کے اسلامی نظریے کی جانب زیادہ مائل تھا۔ نتیجتاً عرب قومیت کا نظریہ مصر میں

اتحاد پیدا کرنے کے بجائے تقسیم کو جنم دینے کا باعث بن گیا۔ جمال عبدالناصر نے عرب قومیت کے نظریے کو باقی عرب دنیا میں بھی مقبول کرانے کوششیں شروع کردیں۔اس کا اثر یہ ہوا کہ شام اور عراق میں بھی عرب قومیت کے نظریے پر نئی حکومتیں معرضِ وجود میں آگئیں۔

1948 کے نکبہ نے فلسطینی عوام کو بہت زیادہ کمزور اور منقسم کردیا تھا۔ فلسطینیوں کا ایک حصہ (غزہ کی پٹی) مصر کے قبضے میں جبکہ دوسرا حصہ {مغربی کنارہ (West Bank)} اردن کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے وطن کا 80 فیصد حصہ تو ویسے ہی صیہونیوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اس طرح فلسطینی تین حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ نکبہ کے بعد یہی دیکھنے کو ملتا ہے کہ اس تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمزوری کے باعث فلسطینی کاز (Cause) کی قیادت فلسطینیوں کے ہاتھ سے نکل کر دیگر عرب ریاستوں کے رہنماؤں، خاص طور پر مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔

جمال عبدالناصر نے فلسطین کے ساتھ کافی حد تک وفاداری نبھائی۔لیکن اُن سے بہت ساری غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ اس ضمن میں شاید ان کی سب سے بڑی غلطی یمن کی خانہ جنگی میں کود پڑنا تھا۔ دراصل جمال عبدالناصر چاہتے تھے کہ یمن میں بھی عرب قومیت کے نظریے کی حامی حکومت برسرِ اقتدار آجائے۔ جمال عبدالناصر کی ان کوششوں کے نتیجے میں یمن کے اندر خانہ جنگی شروع ہوگئی جس میں جمال عبدالناصر نے مصری فوج کے ذریعے اپنے حامیوں کی مدد کی۔ 1965 میں تو حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ مصر کی فوج کا دو تہائی حصہ یمن میں برسرِ پیکار تھا اور پندرہ ہزار سے زائد مصری سپاہی اس جنگ کی نظر ہو چکے تھے۔ یمن میں مصری فوج کی مداخلت اور جنگی کارروائیوں کو نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے اصلی دشمن اسرائیل کے سامنے مصر خطرناک حد تک کمزوری کا شکار ہو گیا۔ اِس کے علاوہ جمال عبدالناصر ایک مغربیت زدہ ذہن کے حامل تھے اور اسی سبب سیکولر عرب قومیت کے پُرزور حمایتی تھے۔لیکن عرب قومیت کا نظریہ فلسطین کو یا عرب دنیا کو کوئی فائدہ پہنچانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ عربوں کی عوام کا بڑا حصہ آج بھی اور ہمیشہ سے اسلام کو اپنی نظریاتی اساس اور اپنی شناخت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ جمال عبدالناصر کے مغربیت زدہ سیکولر عرب قومیت کے نظریے نے عربوں کے اندر صرف تقسیم در تقسیم کے ہی بیج

بوئے اور اس چیز کا فائدہ صرف اسرائیل کو ہوا۔

اتحاد کی کمی، جس کی وجہ سے اسرائیل نکبہ کرنے میں کامیاب ہوا تھا، اب اسرائیل کو نکبہ سے بھی بڑی کامیابی کی طرف لے کر جا رہی تھی۔ نکبہ کے بعد بھی اسرائیل کی ناجائز ریاست نے کسی قسم کی امن پسندی نہ دکھائی تھی بلکہ مسلسل اپنے عرب ہمسائیوں پر حملے جاری رکھے تھے۔ اسرائیل نے ایک فوجی آفیسر ایریئل شیرون (Ariel Sharon)، جو بعد میں اسرائیل کے وزیر اعظم بھی بنے، کی قیادت میں "یونٹ ایک سو ایک" (Unit 101) کے نام سے ایک خاص فوجی دستہ قائم کیا تھا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اردن اور مصر کے علاقوں میں گھس کر عام لوگوں اور عرب فوجیوں کو جارحانہ کارروائیوں کا نشانہ بنائے۔ مثال کے طور پر اکتوبر 1953 میں قِبیہ (Qibya) کے مقام پر ایریئل شیرون اور اُس کے فوجیوں نے ایک خوفناک قتلِ عام کیا (Qibya Massacre) جس میں 70 کے قریب فلسطینی مہاجرین شہید کر دیے گئے۔

1956 میں اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر مصر پر حملہ بول دیا اور صحرائے سینا پر قابض ہو گیا۔ عالمی دباؤ کے سبب اسرائیل کو صحرائے سینا تو 1957 میں خالی کرنا پڑ گیا لیکن اسرائیل نے ساتھ ہی امریکہ سے یہ شرط بھی منوائی کہ اگر آئندہ کبھی آبنائے تیران (Straits of Tiran) کو مصری فوجی جہازوں نے بند کرنے کی کوشش کی تو مصر کا یہ قدم دعوتِ جنگ تصور ہو گا اور اس صورت میں امریکہ نہ صرف اسرائیل کو جنگ کرنے سے روکنے سے دور رہے گا بلکہ اس کی مدد بھی کرے گا۔

1950 اور 1960 کی دہائی میں اسرائیل کو امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی نہ صرف بے پناہ فوجی اور مالی امداد حاصل رہی بلکہ فرانس کی ریاست اور کچھ امریکی یہودی سائنسدانوں نے تو اسرائیل کو ایٹمی ٹیکنالوجی بھی دی اور اسرائیل کو ایک ایٹمی قوت بننے میں مدد دی۔ اس کے علاوہ امریکہ نے بے پناہ اسلحہ، جنگی طیارے، ٹینک اور دیگر جنگی ساز و سامان دے کر اسرائیل کو مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی فوجی قوت بھی بنا دیا۔

1966 تک اسرائیل جنگ کے لیے مکمل طور پر تیار تھا اور اب کئی اسرائیلی قائدین کو لگ رہا تھا کہ یہی موقع ہے جب باقی 20 فی صد فلسطین پر بھی قبضہ کر لینا چاہیے۔ دوسری طرف

مصر یمن کی جنگ میں الجھا ہوا تھا۔ عرب ممالک عرب قومیت کا پرچار تو بہت کررہے تھے لیکن عملاً ان کی کارکردگی صفر تھی اور فقط آپس ہی میں گتھم گتھا تھے۔ اسرائیل کے مقابلے کے لیے وہ کسی صورت میں بھی تیار نہ تھے۔ قوی ہیکل اسرائیل اور آپس میں برسرِ پیکار کمزور عرب ریاستوں کے مقابلے میں فتح کس کی ہونی تھی، اِس کی پیشین گوئی کرنے کے لیے کسی خاص نجومی کی ضرورت نہ تھی۔

1967 کی تباہ کن جنگ

جون 1967 میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان دوسری عرب اسرائیل جنگ برپا ہوئی۔ یہ ایک بہت مختصر جنگ تھی جو صرف 6 روز تک جاری رہی۔ لیکن یہ جنگ فلسطینیوں کے لیے 1948 کے نکبہ سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں عربوں کی شکست نے نہ صرف عرب قومیت کے بت کو پاش پاش کر دیا بلکہ فلسطین کا باقی 20 فی صد حصہ، جس میں مشرقی القدس، بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ شامل تھے، بھی اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔

جنگ کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ 1960 کی دہائی میں اسرائیل اور شام کے درمیان سرحد پر صورت حال کافی تناؤ کا شکار تھی اور بہت زیادہ جھڑپیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ اس کے علاوہ اسرائیلی فوجیں اکثر اردن کے زیرِ انتظام مغربی کنارے (West Bank) میں گھس کر اردنی فوج اور فلسطینیوں کے خلاف بھی جارحانہ کارروائیاں کرتی رہتی تھی۔ نومبر 1966 میں مغربی کنارے کے ایک گاؤں سامو پر اسرائیلی فوج حملہ آور ہوئی، 125 سے زائد گھر اور دیگر عمارات تباہ کر دیں، سینکڑوں لوگوں کو ہلاک کیا اور اردنی فوج کے بیسیوں سپاہیوں کو بھی مار ڈالا۔

اردن کے شاہ حسین، جو کہ شاہ عبداللہ کے پوتے تھے، اسرائیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے حامی تھے۔ لیکن اس خوف ناک حملے کے بعد ان کے لیے اسرائیل کے دشمن اور مصر کے حکمران جمال عبدالناصر کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کرنا ناگزیر بن گیا۔ اس طرح نکبہ کے بعد پہلی مرتبہ اردن نے اسرائیل کے خلاف عرب اتحاد میں شامل ہونے کا عندیہ دیا۔ دوسری طرف شام اور اسرائیل کی سرحد پر صورتحال دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ جنوری سے مئی 1967 کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں اور اسرائیلی فضائیہ نے شام کے 6 جنگی طیارے بھی مار گرائے۔

مئی 1967 میں جمال عبدالناصر کو خبر ملی کہ اسرائیل شام پر حملہ کرنے والا ہے۔ اگرچہ بعد میں پتا چلا کہ یہ خبر جھوٹی تھی لیکن اس خبر نے جمال عبدالناصر کو کافی پریشان کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اسرائیل نے شام پر حملہ کیا تو شام کی کمزور فوج اسرائیل کا وار سہہ نہ سکے گی۔

انہوں نے سوچا کہ اگر وہ اسرائیل کی مغربی سرحد پر مصری فوج کے ذریعے دباؤ ڈال سکیں تو شاید جنگ ٹل جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے امریکہ سے بھی سفارتی سطح پر بات چیت شروع کی تا کہ کسی طرح جنگ کو ٹالا جا سکے۔ یہاں جمال عبدالناصر سے بہت بڑی بھول سرزد ہوئی کہ انہوں نے اپنی فوجی قوت کا غلط اندازہ لگایا۔ یمن کی خانہ جنگی میں اس وقت تک مصر کی مداخلت کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ لیکن اس وقت بھی مصر کی ایک تہائی فوج یمن میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ مصری فوج کے چیف آف سٹاف فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر تھے۔ یہ ایک نہایت ہی نااہل جرنیل تھے اور صرف سیاسی وجوہات کی بنا پر جمال عبدالناصر نے انہیں آرمی چیف بنا رکھا تھا۔ جمال عبدالناصر کے مصر میں مصری فوج ملکی سیاست میں بہت زیادہ دخیل تھی اور اسی وجہ سے اس کی فوجی قابلیت پر کافی سوالیہ نشان موجود تھے۔ جمال عبدالناصر نے 1956 کی جنگ کے بعد اسرائیل کو دی گئی امریکی گارنٹی کو بھی درخور اعتنا نہ جانا، جس کے مطابق مصر کی طرف سے آبنائے تیران (Straits of Tiran) کو بند کرنے کی صورت میں امریکہ نے اسرائیل کو جنگ شروع کرنے کی اجازت دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ 22 ۔مئی 1967 کو جمال عبدالناصر نے اسرائیل پر دباؤ ڈالنے کے لیے آبنائے تیران کو بند کر دیا۔ اسرائیل کے لیے یہ جنگ شروع کرنے کا کھلا لائسنس تھا۔ اسرائیل تو اسی موقعے کی تلاش میں تھا کہ عربوں سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑے اور ان کو شکستِ فاش دے کر باقی 20 فی صد فلسطین پر بھی قبضہ کر لے۔ اب جمال عبدالناصر کے اس غیر دانش مندانہ فیصلے نے اسرائیل کے لیے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا راستہ ہموار کر دیا۔

مئی 1967 کے اواخر میں جہاں اسرائیل جنگ کے لیے بھرپور تیاری کر رہا تھا وہیں جمال عبدالناصر نے امریکہ سے روابط شروع کر دیے۔ جمال عبدالناصر چاہتے تھے کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ کے ٹل جانے سے عرب دنیا میں ان کی مقبولیت میں مزید اِضافہ ہوگا اور وہ یہ کہہ سکیں گے کہ انہوں نے شام کو اسرائیلی جارحیت سے اپنی دانشمندی اور بہادری کے ذریعے بچا لیا ہے۔ لیکن جمال عبدالناصر یہاں امریکہ اور اسرائیل کے گٹھ جوڑ کا صحیح اندازہ لگانے میں ناکام ہو گئے۔ امریکہ نے انتہائی چالاکی سے جمال عبدالناصر کو شیشے

میں اتارااورانہیں اس دھوکے میں رکھا کہ امریکہ اسرائیل کو جنگ شروع کرنے سے باز رکھے گا۔
جمال عبدالناصراپنی جگہ خوش ہوگئے کہ جنگ کوٹالنے کی کوششوں میں امریکہ نے تعاون کی یقین دہانی کرائی ہےاوراسی سلسلے میں انہوں نے اپنے نائب صدرکوامریکہ بھیجنے کااعلان بھی کیا۔ دوسری طرف اسرائیل کے چوٹی کے سینیئر اہلکار،جن میں موساد (Mossad) کے سربراہ میجر جنرل مئیرامِت (Meir Amit) شامل تھے،بھی واشنگٹن میں موجود تھے۔

مئیرامت نے امریکہ کے وزیرِ دفاع رابرٹ میکنمارا(Robert McNamara) سے یکم جون 1967 کوملاقات کی اوراسرائیلی ارادوں کوواضح کیا۔رابرٹ میکنمارانے اسرائیل کے جنگ شروع کرنے کی صورت میں نہ صرف کسی بھی طرح کی مداخلت نہ کرنے کی یقین دہانی کرائی بلکہ اس نے اسرائیل سے ہرممکن فوجی تعاون کرنے کابھی وعدہ کیا۔
ایک طرف عرب سفارتکاراس بات پرخوشیاں منارہے تھے کہ امریکہ جنگ کوملتوی کروادے گا جبکہ دوسری طرف امریکہ عربوں کودھوکے میں رکھ کراسرائیل کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا کہ چلوحملہ کردو۔
عربوں کی جنگی صورت حال کچھ یوں تھی کہ مصراورشام کےعلاوہ اردن بھی جنگ میں کود پڑنے کے لیے تیارتھا۔30 مئی 1967 کواردن کے بادشاہ حسین نےمصرکےصدر جمال عبدالناصر کےساتھ ایک معاہدہ کیا تھاجس کے مطابق اردنی فوجوں کی کمان ایک مصری جنرل عبدالمنعم ریاض کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی۔
5 جون 1967 کواسرائیل نے جنگ کا آغاز ایک نہایت ہبیت ناک فضائی حملے سےکیاجس میں مصر، اردن اورشام کی فضائیہ کومکمل طور پرنیست ونابودکردیا گیا۔جنگ کےآغاز میں ہی فضائیہ سےمحروم ہوجانے کے بعدعرب فوجوں کی کارکردگی نہایت مایوس کن رہی۔ مصری فوج،جوکہ عربوں کی فوجوں میں سب سےبہتراور بڑی مانی جاتی تھی،کواس کے نااہل کمانڈرفیلڈ مارشل عبدالحکیم عامرکی بدولت بغیرکوئی خاص لڑائی لڑے ہی شکست کا سامنا کرنا پڑ گیاجب انہوں نے بدحواسی میں مصری فوجوں کوصحرائے سینا خالی کرنے کاحکم

دیا۔ مصری فضائیہ کی مکمل تباہی کی وجہ سے اب اسرائیلی فضائیہ کو بھرپور موقع مل گیا کہ وہ صحرائے سینا میں سے پسپا ہوتی ہوئی مصری فوج کو اپنے بھرپور حملوں کا نشانہ بنائے۔ اسرائیلی فوج خاص طور پر اسرائیلی ٹینکوں نے تیزی سے مصری فوج کا تعاقب کیا اور نتیجتاً مصر کی ایک لاکھ کے قریب فوج، جو صحرائے سینا ہی میں تھی، مکمل طور پر تباہ وبرباد ہوگئی۔ قریباً دس سے بیس ہزار سپاہی مارے گئے جب کہ تمام بھاری اسلحہ جس میں ٹینک اور توپیں وغیرہ شامل تھیں یا تو تباہ ہوگیا یا پھر اسرائیلیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ تین دن کے اندر ہی اسرائیلی فوجیں صحرائے سینا پر قبضہ کر کے نہر سویز (Suez Canal) تک پہنچ گئیں اور عملاً مصری فوج کو مکمل شکست ہوگئی، جس کے بعد مصر جنگ میں مزید کوئی حصہ نہ لے سکا۔

اردن کے محاذ پر یہ ہوا کہ فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر، جو کہ سینائی میں مصری فوجوں کی شکست کے ذمہ دار تھے، نے مصری جنرل عبدالمنعم ریاض کو یہ جھوٹا پیغام بھیجا کہ مصری فوجیں مغربی سرحد پر اسرائیل کے خلاف فتوحات حاصل کر رہی ہیں، اس لیے آپ بھی اردن کی طرف سے فوراً حملہ کر دیں۔ جنرل عبدالمنعم ریاض اور شاہ حسین نے اس پیغام کے موصول ہوتے ہی فوراً اسرائیلی فوجوں پر حملہ کر دیا لیکن اسرائیلی فوجیں مکمل طور پر تیار تھیں اور انہوں نے اردنی فوجوں کو شکستِ فاش دے دی۔ اس شکست کے نتیجے میں مغربی کنارے (West Bank) کا پورا علاقہ، جس میں بیت المقدس، مسجدِ اقصی اور مشرقی القدس بھی شامل تھے، اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔ شام کے محاذ پر بھی اسرائیل کی فوج کو بھرپور فتح حاصل ہوئی اور جولان کی اہم پہاڑیوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا، جس کے بعد شامی دارالحکومت دمشق اسرائیلی فوجوں کی زد میں آ گیا۔

1967 کی جنگ میں عربوں کی بدترین شکست نے جمال عبدالناصر اور ان کے عرب قومیت کے نظریے پر ویسا ہی داغ لگایا جیسے عرب ممالک کے مغربی کٹھ پتلی بادشاہوں کی حکومتوں پر نکبہ کے بعد لگا تھا۔ اسرائیل نے وسیع وعریض علاقوں پر قبضہ کر لیا اور پوری دنیا میں اپنی فوجی قوت کی دھاک بٹھا دی۔

اس جنگ میں بے مثال کامیابی کے بعد امریکہ میں صیہونی لابی بہت زیادہ طاقت ور

ہوگئی۔ 1967 کے بعد امریکہ میں صیہونی لابی نے ہر امریکی حکومت کو یہ باور کرانا شروع کیا کہ اسرائیل کی ننھی سی ریاست اکیلے ہی تمام مشرقِ وسطیٰ کے باقی ممالک سے زیادہ فوجی قوت رکھتی ہے اور امریکہ کے تزویراتی (Strategic) مفادات کے تحفظ کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اسرائیل سے بہترین تعلقات کو اپنی ترجیح بنائے اور اسرائیل کی ہر طرح کی مالی اور فوجی امداد کے لیے ہر وقت تیار رہے۔

فلسطینیوں، اور خاص کر ان فلسطینیوں کے لیے جنہوں نے 1948 کے نکبہ میں بھی ہجرت کی تھی، کے لیے 1967 کی جنگ کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ ایک بار پھر اسرائیل کا عفریت ان کے گھروں کے دروازوں تک آ پہنچا۔ بہت سے فلسطینی مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی سے نقل مکانی کر گئے، جن پر اب اسرائیل کا مکمل قبضہ ہوگیا تھا۔ ان کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں فلسطینی اسرائیلی جبرِ مسلسل تلے پسنے پر مجبور ہوگئے اور آج تک پس رہے ہیں۔

1967 کی جنگ سے پہلے عربوں کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ فلسطین کی ریاست کو بحال کیا جائے اور نکبہ کے دوران جو فلسطینی زبردستی گھروں سے نکالے گئے، انہیں واپس آنے کا موقع دیا جائے (Right of Return)۔ اسرائیل نے ہمیشہ ان مطالبات کی مخالفت کی تھی کیونکہ اس سے مقبوضہ فلسطین/ اسرائیل کے اندر دوبارہ عربوں کی اکثریت ہوجاتی لیکن 1967 کے بعد منظر نامہ یکسر تبدیل ہوگیا۔ 1967 کے بعد سے آج تک عرب صرف اتنا مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں چھوٹی سی فلسطینی ریاست صرف ان علاقوں کو شامل کر کے ہی بنا دی جائے جن پر اسرائیل نے 1967 میں قبضہ کیا تھا یعنی کہ مغربی کنارہ (West Bank)، مشرقی القدس اور غزہ کی پٹی مگر اسرائیل اس مطالبے پر بھی ہٹ دھرمی دکھاتا آ رہا ہے اور فلسطین کی اس چھوٹی سی ریاست کو تسلیم کرنے کے بجائے اس علاقے میں بھی فلسطینیوں کی مکمل نسل کشی کرنے کی مسلسل کوششیں کر رہا ہے۔

آخر میں اگر ہم 1967 کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کا مختصر سا تجزیہ کریں تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فوج کو سیاست میں ملوث کرنا، فوجی آفیسرز کو پیشہ وارانہ مہارت کی بجائے ان کی سیاسی وفاداریوں کی بنا پر ترقیاں دینا، اپنے اصلی دشمن کو نظر انداز کر کے

دیگرممالک کی سیاست یاخانہ جنگیوں میں مداخلت کر کے اپنی قوت کو کمزور کرنا ،اسرائیل اورامریکہ کے گٹھ جوڑکونظرانداز کرنااوراسلامی نظریے کی بجائےنسلی ولسانی قومیت کےنظریےکوفوقیت دینا،وہ مرکزی وجوہات تھیں جن کی وجہ سےعربوں کواسرائیل کی چھوٹی سی صیہونی ریاست کے ہاتھوں تاریخ کی بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

فَاعتَبِرُوایااُولِی الاَبصَارِ۔(سورۃ البقرہ، آیت59)

ترجمہ:" پس عبرت حاصل کرواے دیدہ بینار کھنے والو!"

اردن اور مصر کی فلسطین کے ساتھ غداری

1967 کی تباہ کن جنگ کے بعد عرب ممالک فلسطین کی حمایت سے عملاً پیچھے ہٹنے لگے۔ اب عرب ممالک کا سارا دھیان اپنے ان علاقوں کو واگزار کروانے پر تھا جن پر اسرائیل نے 1967 کی جنگ میں قبضہ کیا تھا۔ فلسطینی ایک بار پھر مکمل طور پر بے یار و مددگار رہ گئے۔ لیکن 1967 کی جنگ کے بعد جو اہم تبدیلی دیکھنے کو ملی وہ یہ تھی کہ 1948 کے نکبہ کے بعد پہلی بار فلسطینیوں کی آزادی کی جدوجہد کی قیادت دوبارہ فلسطینیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

فلسطینی حریت پسند تنظیموں میں فتح کی سیکولر تنظیم اور پی۔ ایف۔ ایل۔ پی (Popular Front for Liberation of Palestine) کی بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی (Leftist) تنظیم زیادہ نمایاں تھیں۔ فتح کی قیادت یاسر عرفات جب کہ جب کہ پی۔ ایف۔ ایل۔ پی کی قیادت ایک فلسطینی عیسائی ڈاکٹر جارج حبش (George Habash) کر رہے تھے۔ فتح اور پی۔ ایف۔ ایل۔ پی دونوں مسلح جدوجہد کے ذریعے فلسطین کو آزاد کرانا چاہتی تھیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے اسرائیل کے خلاف مسلح کارروائیاں کرتی رہتی تھیں۔ جہاں فتح اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی افواج کے خلاف جنگی کارروائیاں کر کے شہرت حاصل کر رہی تھی، وہیں پی۔ ایف۔ ایل۔ پی نے بین الاقوامی طور پر جہاز ہائی جیک کر کے اسرائیل پر دباؤ ڈالنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان تنظیموں کے فلسطینی گوریلوں کی اکثریت اردن میں قیام پذیر تھی جہاں سے وہ اسرائیل کے خلاف کارروائیاں کیا کرتے تھے۔ فلسطینی گوریلوں کی ہزاروں کی تعداد میں اردن میں موجودگی اردن کے شاہ حسین کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ شاہ حسین اب یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح دوبارہ امریکہ کی منت سماجت کر کے امریکہ کے ذریعے اسرائیل کو راضی کریں کہ وہ مغربی کنارہ (West Bank) دوبارہ اردن کے حوالے کر دے۔ اس کے علاوہ شاہ حسین کو فلسطینی گوریلوں کے ہاتھوں اپنا اقتدار کھو دینے کا خوف بھی تھا۔

شاہ حسین یہ جانتے تھے کہ اردن کی آبادی کی اکثریت انہی فلسطینیوں پر مشتمل

ہے جونکبہ اور 1967 کے بعد ہجرت کر کے اردن میں آئے تھے۔ یہ فلسطینی آبادی اردن کے بادشاہ کو اس کی امریکہ اور اسرائیل نوازی کی وجہ سے بہت زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا کرتی تھی، اور یاسر عرفات اور جارج حبش جیسے لوگوں کو اپنا لیڈر مانتی تھی۔

شاہ حسین کے پاس فلسطینی گوریلوں سے نمٹنے کے لیے امریکی تربیت یافتہ اور امریکی اسلحے سے لیس ایک باقاعدہ طاقتور فوج موجود تھی۔ ستم ظریفی کی بات تو یہ ہے کہ جو فوج اسرائیل کے خلاف ہمیشہ ناکام ہوئی تھی وہ فلسطینی گوریلوں کے خلاف ایک مؤثر ہتھیار ثابت ہوئی۔ 1968 سے لے کر 1970 تک فلسطینی گوریلوں اور اردنی فوج کے درمیان اردن کے اندر کئی خونریز جھڑپیں بھی ہوئیں۔ لیکن ہر بار جھڑپوں کے بعد معاملات کچھ مذاکرات کے ذریعے حل ہو جاتے اور اس کے بعد اگلی جھڑپ تک حالات کچھ معمول پر رہتے۔ یہ طریقہ کار 1970 تک جاری رہا مگر 1970 میں حالات کھلے تصادم کی طرف بڑھنے لگے۔

1970 کے اوائل میں اردنی فوج فلسطینی گوریلوں سے نمٹنے کی تیاری میں مصروف تھی مگر ابھی تک پوری طرح تیار نہ ہوئی تھی۔ ڈاکٹر جارج حبش نے اس موقعہ پر یاسر عرفات کو مشورہ دیا کہ انہیں چاہیے کہ فلسطینی گوریلوں کے ذریعے اردنی حکومت کے خلاف ایک بھرپور جنگ کا آغاز کر کے شاہ حسین کو اقتدار سے فارغ کریں تا کہ اردن کو ایک فلسطینی ریاست میں تبدیل کیا جا سکے۔ ڈاکٹر جارج حبش کا یہ ماننا تھا کہ جب تک فلسطینیوں کو اپنی ایک ریاست حاصل نہیں ہوتی تب تک وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہی رہیں گے اور جن عرب ریاستوں کے وہ رحم و کرم پر رہیں گے وہ کسی بھی وقت انہیں دھوکا دے سکتی ہیں۔ یاسر عرفات جارج حبش کی اس بات سے اتفاق تو کرتے تھے کہ موجودہ اردنی حکومت کا خاتمہ ہو جانا چاہیے لیکن انہوں نے 1970 کے اوائل میں اردنی حکومت کے خلاف کھلی جنگ شروع کرنے کا مشورہ قبول نہ کیا۔

یاسر عرفات نے ڈاکٹر جارج حبش کو یہ کہا کہ اگر ہم اردنی حکومت کو ہٹانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ امریکہ اور اسرائیل ہمارے اوپر اردن میں بھرپور حملہ کریں گے، جس کے بعد ہمارے لیے بھی اردن کے اندر اقتدار میں رہنا ناممکن ہو جائے گا اور فائدہ کچھ نہ ہوگا۔ ڈاکٹر جارج حبش کا کہنا تھا کہ اگر ہم اردن کی حکومت پر قبضہ کر لیں

توشام کی حکومت نے ہمیں تعاون کا یقین دلایا ہے اور مصر بھی ہماری امداد کرے گا۔ اس کے علاوہ سوویت روس (Soviet Russia) بھی ہماری پشت پناہی کرے گا۔

لیکن یاسر عرفات نے ان کی اس دلیل کو قبول نہ کیا اور اردن کی حکومت کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کا ایک نادر موقع ہاتھ سے جانے دیا۔ ستمبر 1970 تک اردنی فوج مکمل طور پر تیار ہو چکی تھی اور اس نے فلسطینی گوریلوں کے خلاف اچانک کھلی جنگی مہم کا آغاز کر دیا۔ اس کارروائی میں ہزاروں فلسطینی گوریلے اور بہت سارے فلسطینی شہری مارے گئے جسے بعد میں سیاہ ستمبر (Black September) کا نام دیا گیا۔ جب اردنی فوج نے فلسطینی گوریلوں کے خلاف بھرپور جنگی کارروائیاں شروع کیں تو یاسر عرفات کو توقع تھی کہ شام کی حکومت جس نے ان کی بھرپور مدد کا وعدہ کر رکھا تھا اب اپنا وعدہ پورا کرے گی۔ اس وقت شام کی حکومت چند جرنیلوں کے ہاتھ میں تھی جن میں سب سے اہم بری فوج کے جنرل صلاح جدید اور فضائیہ کے جنرل حافظ الاسد تھے۔ جنرل صلاح جدید نے شامی فوج کی ایک بھاری جمعیت کو فلسطینیوں کی مدد کے لیے اردن کے اندر داخل ہونے کے احکامات دے دیے۔ لیکن اس موقع پر حافظ الاسد نے ایک چال چلی اور فضائیہ کو شامی فوج کی مدد کے لیے بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ نتیجتاً اردنی فضائیہ نے بھرپور حملے کر کے بہت سے شامی ٹینک تباہ کر دیے اور شامی فوج پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی۔ شامی فوج کے پسپا ہوتے ہی اردن میں فلسطینی گوریلوں کی شکست بھی یقینی ہو گئی اور اس طرح سیاہ ستمبر کے دوران شاہ حسین نے اپنے جدِ امجد شریف حسین اور اپنے دادا شاہ عبداللہ کی طرح فلسطین کی جدوجہدِ آزادی کے مقصد سے غداری کر کے غدار ابن غدار کا لقب حاصل کیا۔

حافظ الاسد نے شامی فوج کی مدد اس لیے نہ کی تھی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ شامی فوج شکست کھا جائے اور جنرل صلاح جدید کی سیاسی قوت نتیجتاً کمزور ہو جائے۔ حافظ الاسد جنرل صلاح جدید کو راستے سے ہٹا کر شام کے مطلق العنان حکمران بننا چاہتے تھے اور اس مقصد میں انہیں کامیابی بھی ہوئی جب مارچ 1971 میں انہوں نے صلاح جدید کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور شام کے آمر (Dictator) بن گئے۔ فلسطین کی جدوجہدِ آزادی کی پیٹھ میں اردن

کے چُھر اگھونپنے کے بعد فلسطینی گوریلوں کے پاس اردن کو چھوڑنے کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ فلسطینی گوریلوں کی بھاری اکثریت لبنان میں منتقل ہوگئی جہاں کی کمزور حکومت ان کے داخلے کو روکنے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ سیاہ ستمبر کے بعد اگلے بارہ سال تک فلسطینی گوریلا جنگجو لبنان کی سرزمین سے ہی اسرائیل کے خلاف کارروائیاں کرتے رہے۔

1967 کی جنگ نے مصر کی پالیسی میں بھی بہت تبدیلی پیدا کردی تھی۔ مصر کا مقصد اب فلسطین کی جدوجہدِ آزادی کی حمایت کرنے سے زیادہ صحرائے سینا کو اسرائیل سے واگزار کرانا تھا۔ مصری صدر جمال عبدالناصر نے اس پالیسی کا اعلان تو کبھی نہ کیا لیکن 1967 کے بعد سے مصر کی طرف سے فلسطین کی عملی اور حقیقی حمایت تقریباً ختم ہوگئی۔ 1970 میں جمال عبدالناصر انتقال کر گئے اور ان کی جگہ ان کے ایک ساتھی انور سادات نے اقتدار سنبھال لیا۔

انور سادات یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح پُرامن طریقے سے ہی اسرائیل کو صحرائے سینا خالی کردینے پر قائل کرلیں۔ انہوں نے امریکہ کی مدد سے اسرائیل سے مذاکرات بھی کرنے کی کوشش کی لیکن اسرائیل نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ انور سادات کو اب یہ اندازہ ہوگیا کہ اسرائیل سے جنگ کے بغیر صحرائے سینا کو واپس لینا ممکن نہیں ہے۔

یہ بات انور سادات بھی جانتے تھے کہ مصری فوج میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ پورے صحرائے سینا کو بہ زورِ بازو اسرائیل سے واپس لے لے۔ اپنی اس کمزوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے جرنیلوں کو اسرائیل کے خلاف ایک محدود جنگ (Limited War) کا منصوبہ بنانے کا کام سونپا۔ اس وقت مصر کے چیف آف آرمی سٹاف ایک انتہائی قابل جنرل سعد الشاذلی تھے۔ جنرل سعد الشاذلی نے یہ منصوبہ بنایا کہ اگر مصر اسرائیل پر نہر سوئز (Suez Canal) کو پھلانگ کر اچانک حملہ کر دے اور نہر سوئز کے پورے مشرقی کنارے پر قبضہ کر لے تو اس کے نتیجے میں اسرائیل کو مذاکرات کی میز پر آنے پہ مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اگر اسرائیل مذاکرات پر راضی نہ بھی ہوا تو مستقبل میں پھر نہر سوئز کے مشرقی کنارے پر ہی فوجوں کا مزید اجتماع کر کے صحرائے سینا کے اندر مزید کارروائیاں بھی کی جا سکتی ہیں۔ انور سادات کو یہ منصوبہ پسند آیا۔

انہیں یہ اندازہ تھا کہ اگر وہ صرف نہر سوئز کے مشرقی کنارے پر ہی قبضہ کر لیتے ہیں تو یہ فتح اسرائیل پر یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگی کہ اسرائیل جب تک صحرائے سینا پر اپنا قبضہ برقرار رکھے گا تب تک یہ اس کو مہنگا پڑتا رہے گا۔ اسی وجہ سے انور سادات کا یہ خیال تھا کہ ایک کامیاب محدود جنگ کے بعد اسرائیل اور امریکہ اس بات پر راضی ہو جائیں گے کہ صحرائے سینا کو خالی کر دیا جائے۔ انور سادات کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ امریکہ اور اسرائیل کو رام کرنے کے لیے اس بات کی یقین دہانی بھی کرائی جاسکتی ہے کہ صحرائے سینا خالی کر دینے کے بعد مستقبل میں مصر کی طرف سے فلسطین کی کوئی حمایت نہ کی جائے گی۔

جنرل سعد الشاذلی اور مصری فوج البتہ انور سادات کے اس سیاسی کس بل سے بے خبر تھے اور ان کے ذہن میں یہی تھا کہ صحرائے سینا کی آزادی فلسطین کی آزادی کی جدوجہد کی طرف پہلا قدم ثابت ہوگا۔ 6 اکتوبر 1973 کو مصری افواج نے اچانک صحرائے سینا میں موجود اسرائیلی فوجوں پر ہلہ بول دیا۔ جنرل سعد الشاذلی کا منصوبہ مکمل طور پر کامیاب رہا اور نہر سوئز کی جنگ میں مصر کو نمایاں فتح حاصل ہوئی، جس کے نتیجے میں مصر نے نہر سوئز کے مشرقی کنارے پر قبضہ کر لیا۔

6۔اکتوبر 1973 کو ہی شام کی فوج نے بھی مصر کے ہمراہ اسرائیل پر حملہ کر دیا اور جولان کی پہاڑیوں کو واپس لینے کی کوشش شروع کر دی لیکن جہاں نہر سوئز پر مصر کو فتح حاصل ہوئی وہیں جولان کی پہاڑیوں پر شام کی فوج فتح حاصل کرنے میں ناکام رہی اور اسرائیل کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ شام کے حکمران حافظ الاسد نے اس موقع پر انور سادات سے مدد کی درخواست کی اور کہا کہ شام پر سے دباؤ ہٹانے کے لیے آپ مصر کی جانب سے مزید حملے کریں۔ جنرل سعد الشاذلی نے انور سادات کو بارہا سمجھایا کہ اس وقت ہماری اتنی قوت نہیں کہ ہم نہر سوئز کے مشرقی کنارے سے آگے پیش قدمی کر سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہر سوئز کا مشرقی کنارا روس کے فراہم کردہ طیارہ شکن میزائلوں {SAMs(Surface to Air Missiles)} کی وجہ سے مصری فوجوں کے لیے محفوظ ہے۔ لیکن اگر مصری فوج صحرائے سینا میں مزید آگے بڑھی تو طاقتور اسرائیلی فضائیہ ان کے پرخچے اڑا دے گی۔

انور سادات مگر اس وقت سخت دباؤ کا شکار تھے اور انہوں نے جنرل سعد الشاذلی کے پیشہ ورانہ تجزیے کو مسترد کر کے سیاسی وجوہات کی بنا پر مصری افواج کو صحرائے سینا کے اندر پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ نتیجتاً جنرل سعد الشاذلی کی بات صحیح ثابت ہوئی اور اسرائیلی فضائیہ نے مصری فوج کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔

اس شکست کے بعد اسرائیل کو یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ خود مصر کے اندر اپنی فوج داخل کر دے اور اسرائیلی فوج نے بھی ایک مقام سے نہر سوئز پھلانگ کر مصر کے اندر کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اب انور سادات بہت زیادہ پریشان ہو گئے اور اس شکست کی وجہ سے بدحواس ہو کر انہوں نے امریکہ اور اقوام متحدہ کی جانب سے جنگ بندی (Ceasefire) کی پیش کش قبول کر لی اور یوں 1973 کی عرب اسرائیل جنگ اپنے انجام کو پہنچی۔

1973 کی عرب اسرائیل جنگ آخری عرب اسرائیل جنگ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد سے لے کر آج تک کسی بھی عرب ملک نے اسرائیل کے خلاف جنگی کارروائی کرنے کی جرأت نہیں کی۔

انور سادات نے اپنے ذہن میں جو سیاسی خاکہ بنایا تھا، 1973 کی جنگ کے بعد وہ اسی پر عمل پیرا ہوئے۔ انہوں نے امریکہ کے وزیر خارجہ ہینری کسنجر (Henry Kissinger) کی وساطت سے اسرائیل کے ساتھ بات چیت شروع کی اور اسرائیل نے چند شرائط کے تحت صحرائے سینا کو 1975 میں خالی کر دیا۔ اس کے دو سال بعد 1977 میں انور سادات مقبوضہ القدس تشریف لے آئے۔ انہوں نے وہاں اسرائیلی پارلیمنٹ (Knesset) سے خطاب بھی کیا اور یہ واضح کیا کہ مصر تو اسرائیل کے ساتھ امن چاہتا ہے۔ اس کے ایک سال بعد 1978 میں امریکہ کے صدر جمی کارٹر کی مدد سے اسرائیلی وزیر اعظم مناخم بیگن (Menachem Begin) اور انور سادات کے درمیان جامع مذاکرات شروع ہوئے اور 1978 میں کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے تحت مصر نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا وعدہ کر لیا۔ یہاں پر یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا کہ اسرائیل کے اس وقت کے وزیر اعظم مناخم بیگن برطانوی راج کے دنوں میں صیہونی دہشت گرد تنظیم ارگن (Irgun) کے سربراہ تھے اور دیر یاسین کا خوف ناک قتلِ عام (Deir

Yassin Massacre) بھی مناخم بیگن کی قیادت میں ہی ہوا تھا جس کا انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں اپنی سوانح عمری میں بھی ذکر کیا ہے۔لیکن بہر حال انور سادات نے 1978 میں مناخم بیگن کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ میں ہاتھ ملایا اور فلسطین کی جدوجہدِ آزادی سے ہمیشہ کے لیے مصر کے ہاتھ بھی صاف کر لیے۔ اس وقت مصر میں یہی کہا گیا تھا کہ مصر ہمیشہ اسرائیل سے جنگ نہیں کر سکتا اور مصر کی معاشی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے امن کی سخت ضرورت ہے۔آج تقریباً پچاس سال بعد ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ مصر کی معاشی صورتحال میں تو کوئی بہتری واقع نہیں ہوئی البتہ مصر کی اشرافیہ دن دگنی رات چگنی ترقی کر رہی ہے جب کہ عوام پس رہے ہیں۔

بنیادی طور پر کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ مصر کی اشرافیہ کا معاہدہ تھا جو انہوں نے صرف اس لیے کیا تھا تا کہ وہ اقتدار اور دولت و ثروت کے مزے کامیابی سے لوٹتے رہیں اور امریکہ کی مدد سے اپنی عوام کو بھی دبائے رکھیں تا کہ وہ ان کے ظلم اور لوٹ مار کے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوں۔ مصری عوام کو اس معاہدے سے کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ یہ معاہدہ فلسطین کے ساتھ سنگین غداری تھا۔ پہلے اردن اور اب مصر کی فلسطین کی جدوجہدِ آزادی کے ساتھ غداری کے بعد اب فلسطینی پوری دنیا میں تنہا رہ گئے تھے، لیکن انہوں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔

لبنان میں اسرائیلی خونریز جنگی کارروائیاں

سیاہ ستمبر (Black September) کے سانحے کے بعد فلسطینی گوریلوں اور رہنماؤں کی بھاری اکثریت لبنان منتقل ہوگئی تھی۔ لبنان کا ملک اندرونی انتشار کا شکار تھا۔ جنگ عظیم اول کے بعد اس علاقے پر فرانس کی عمل داری قائم ہوگئی تھی۔ فرانس کے دور میں لبنانی عیسائیوں کو بہت زیادہ مراعات اور عہدے دیے گئے تھے اور فرانسیسیوں نے لبنان کے لیے جو قانون وضع کیا تھا، اس میں لبنانی عیسائیوں کو پانچ کے مقابلے میں چھ کے تناسب سے اسمبلی میں اکثریت دے دی گئی تھی۔ اگرچہ لبنانی عیسائی کل لبنانی آبادی کا محض 33 فیصد تھے اور باقی دوتہائی آبادی مسلمان تھی جن میں تقریباً آدھے شیعہ اور آدھے سنی تھے۔

فرانس کی لبنان سے رخصتی اور لبنان کی آزادی کے بعد بھی لبنانی عیسائیوں نے لبنانی ریاست پر اپنا تسلط قائم رکھا تھا۔ اب جب فلسطینی گوریلوں کی ایک بڑی تعداد لبنان میں آن پہنچی تو لبنان کی کمزور حکومت ان کو روک نہ سکی۔ لبنان کے اندر پہلے ہی تین لاکھ کے قریب فلسطینی مہاجرین انتہائی برے حالات میں پناہ گزین تھے۔ فلسطینی گوریلوں کی آمد سے ان فلسطینی مہاجرین کو بھی کچھ حوصلہ ہوا اور فلسطینی حریت پسند تنظیموں نے جلد ہی لبنان کے کچھ علاقوں پر اپنی عملداری قائم کرلی۔ عملی طور پر فلسطینیوں نے لبنانی ریاست کے اندر ایک اور ریاست بنالی (State within a State) جس کی اپنی معیشت اور اپنی فوج بھی تھی۔ لبنان کے مسلمانوں کو فلسطینیوں سے کوئی خاص مسائل نہ تھے لیکن لبنانی عیسائی فلسطینیوں سے جلد ہی شدید خائف ہوگئے۔ لبنانی عیسائیوں کو یہ خیال ستانے لگا کہ اب مضبوط فلسطینی عسکری تنظیموں کے بل بوتے پر لبنانی مسلمان بھی ان کی سیاسی اجارہ داری کو للکار سکتے ہیں۔ اس وقت تک لبنانی فوج لبنانی عیسائیوں کے تقریباً مکمل قابو میں تھی اور آفیسروں کی اکثریت عیسائیوں پر ہی مشتمل تھی، جبکہ سپاہیوں میں اکثر مسلمان تھے۔ لبنانی عیسائیوں کو اب یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ لبنانی مسلمان فلسطینیوں کے ساتھ سازباز کرکے لبنانی فوج کے اندر بغاوت بھی پیدا کرواسکتے ہیں۔ اس خوف کی وجہ سے لبنانی عیسائیوں نے اپنی عسکریت پسند تنظیمیں (Militia) تشکیل

دینا شروع کردیں۔ ان میں سعد حداد کی جنوبی لبنانی آرمی اور الجمیل فیملی (Gemayel Family) کی فیلنجسٹ ملیشیا (Phalangist Militia) کافی زیادہ مشہور ہوئیں۔ 1975 میں فیلنجسٹ ملیشیا کے سپاہیوں نے 27 فلسطینیوں کو لبنان کے صدر مقام بیروت میں بیدردی سے قتل کردیا۔ فیلنجسٹ ملیشیا نے اس پر بس نہ کی بلکہ تل الزعتر کے فلسطینی مہاجر کیمپ پر بھی گولا باری شروع کردی۔ اس بدترین ظلم کے نتیجے میں لبنان کے اندر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ لبنانی عیسائی عسکریت پسند تنظیمیں فلسطینیوں اور لبنانی مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوگئیں۔ جنگ کے شروع میں ایسا لگتا تھا کہ لبنانی عیسائی جلد ہی شکست کھا جائیں گے لیکن اس موقع پر انہیں ایک انوکھے ذریعے سے امداد پہنچی۔ شام کے صدر حافظ الاسد نے شامی فوج کی ایک بہت بڑی تعداد لبنان کے اندر داخل کردی، جس نے لبنانی عیسائیوں کو مکمل شکست سے دوچار ہونے سے بچالیا۔

حافظ الاسد لبنان کے اندر اپنا اثر ورسوخ بڑھانا چاہتے تھے اور انہیں یہ لگ رہا تھا کہ اگر لبنانی مسلمان اور فلسطینی اس خانہ جنگی میں جلدی کامیاب ہوگئے تو لبنان کے اندر شام کا اثر و رسوخ بڑھانے کا ایک سنہری موقع ضائع ہوجائے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ خانہ جنگی زیادہ طویل ہو تاکہ شام کو لبنان کے اندر دخیل ہونے کا زیادہ موقع ملے۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ حافظ الاسد کی لبنان کی خانہ جنگی میں شمولیت کو امریکہ کی آشیرواد حاصل تھی۔ ایک طرف امریکہ اسرائیل کی شام کے خلاف حمایت کرتا رہا تھا دوسری طرف وہ لبنان کی خانہ جنگی کو بھڑکانے میں شام کی بھی مدد کررہا تھا۔ اس طرح کے امریکی ہتھکنڈوں کو دیکھ کر ایرانیوں کا امریکہ کو دیا گیا خطاب "شیطانِ بزرگ" کافی درست معلوم ہونے لگتا ہے۔ حافظ الاسد کی امداد کے باوجود لبنانی عیسائیوں کی جنگی صورتحال کافی کمزور تھی۔ مارچ 1976 میں فیلنجسٹ ملیشیا نے باضابطہ طور پر اسرائیل سے مدد کی درخواست کی۔ اسرائیلی وزیراعظم یتزاک رابین (Yitzhak Rabin) نے 1976 میں فیلنجسٹ ملیشیا اور سعد حداد کی جنوبی لبنانی فوج کو تقریباً ڈیڑھ سوملین ڈالر کی خطیر رقم کی امداد دی۔

1977 میں جب مناخم بیگن اقتدار میں آئے تو انہوں نے اس امداد میں مزید اضافہ

بھی کر دیا۔ دسمبر 1980 میں اسرائیل لبنان کی خانہ جنگی میں خود بھی داخل ہو گیا اور جنوبی لبنان کی سرحدوں پر، جہاں سعد حداد کی جنوبی لبنانی فوج کو فلسطینی گوریلوں کے ہاتھوں شکست کا سامنا تھا، اسرائیلی فوجوں نے فلسطینی گوریلوں کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کر دیں۔

1982 میں اسرائیل کے وزیر دفاع ایریل شیرون فیلنجسٹ ملیشیا کے قائد بشیر الجمیل سے ملے اور دونوں کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت اسرائیل نے بشیر الجمیل کو لبنان کا اقتدار دلانے کا وعدہ کیا۔ 6 جون 1982 کو 80 ہزار اسرائیلی فوجی لبنان میں داخل ہو گئے۔ اسرائیلی فوجوں نے نہایت بے رحمی سے لبنان میں فلسطینیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ صور (Tyre) کے شہر کو تقریباً مکمل طور پر برباد کر دیا گیا۔ اسرائیلی جارحیت کے پہلے دو ہفتوں میں ہی، انٹرنیشنل ریڈ کراس کے مطابق، 14 ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے اور بیس ہزار سے زائد لوگ زخمی ہوئے۔ ان میں سے اکثریت عام شہریوں پر مشتمل تھی۔ 10 جون 1982 کو اسرائیلی فوج بیروت کے گردونواح میں پہنچ گئی۔ مغربی بیروت، جہاں لبنانی مسلمان اور فلسطینیوں کی اکثریت تھی، اسرائیلی فوجوں کے ہاتھوں مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ بیروت کے اوپر اسرائیلی گولہ باری اور بمباری سات ہفتوں تک جاری رہی۔ ان سات ہفتوں میں ہزاروں فلسطینی اور لبنانی مسلمان شہید ہوئے۔ سات ہفتے اسرائیل کی سنگ باری سہنے کے بعد یاسر عرفات نے بالآخر ہار مان لی اور 12 اگست 1982 کو انہوں نے امریکی ثالثی سے طے شدہ جنگ بندی کا منصوبہ (Ceasefire) منظور کر لیا۔

فلسطینی تاریخ دان رشید خالدی کے مطابق پچاس ہزار سے زائد لوگ بیروت میں مارے گئے یا زخمی ہوئے، جن میں بھاری اکثریت عام شہریوں کی تھی۔ جنگ بندی کی شرائط یہ تھیں کہ تمام فلسطینی حریت پسند گوریلے لبنان کو خالی کر دیں گے۔ نتیجتاً فلسطینی گوریلے اور ان کے قائدین جن میں یاسر عرفات بھی شامل تھے، لبنان کو خالی کر گئے اور انہیں تیونس (Tunisia) جانے کا راستہ فراہم کیا گیا۔ یاسر عرفات نے امریکہ سے اس بات کی یقین دہانی لی تھی کہ فلسطینی گوریلوں کے جانے کے بعد عام فلسطینیوں کا تحفظ کیا جائے گا۔ لیکن اسرائیل نے جنگ بندی ہو جانے کے بعد اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا اور عام فلسطینیوں کے

خلاف جارحانہ کارروائیاں جاری رکھیں۔ اس ضمن میں سب سے خوفناک قتلِ عام بیروت کے علاقوں صبرا اور شاتیلا میں ہوا (Sabra and Shatila Massacre) جہاں ہزاروں فلسطینیوں کو اسرائیلی حمایت یافتہ فیلنجسٹ ملیشیا نے انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا۔ قتل ہونے والوں میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی تھی۔ ایک یہودی فلم ساز جارج سلوزر (George Sluizer) کے مطابق صبرا اور شاتیلا کے قتلِ عام میں اسرائیلی وزیرِ دفاع ایریل شیرون خود بھی شریک تھے۔ جارج سلوزر کہتے ہیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایریل شیرون نے دو معصوم بچوں کو گولی مار کر جاں بحق کر دیا۔ لبنان سے فلسطینی گوریلے تو رخصت ہو گئے لیکن فتح یہاں اسرائیل کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ جنوبی لبنان میں اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں لبنانی شیعہ، جو جنوبی لبنان میں اکثریت میں تھے، اسرائیل کے سخت مخالف ہو گئے۔ لبنانی شیعہ مسلمانوں نے 1982 میں ہی "حزب اللہ" کی تنظیم بنائی جو کہ اسرائیل کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوئی۔ 1982 سے لے کر 2000 تک حزب اللہ مسلسل اسرائیل کے خلاف لبنان میں کارروائیاں کرتی رہی اور 2000 میں اسرائیل نے آخرکار جنوبی لبنان کو خالی کر دیا۔

لبنان کی جنگ اسرائیل کی پہلی غیر روایتی جنگ تھی۔ اگرچہ یہ ایک بہت ہی خوفناک جنگ ثابت ہوئی جس میں لاتعداد عام شہری مارے گئے لیکن مسئلہِ فلسطین کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ اسرائیل جنگ کے ذریعے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا۔

پہلی انتفاضہ اور حماس کا قیام

دسمبر 1987 میں ایک دن اسرائیلی فوج کے ایک ٹینک ٹرانسپورٹ ٹرک نے چار فلسطینیوں کو کچل کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چاروں شہدا کے جنازے بڑے بڑے احتجاجی مظاہروں کی شکل اختیار کر گئے۔ انہی احتجاجی مظاہروں سے پہلی "انتفاضہ" کی فلسطینی تحریک کا آغاز ہوا۔ لفظ "انتفاضہ" کے معنی مزاحمت کے ہیں۔ پہلی انتفاضہ میں خاص بات یہ تھی کہ یہ ایک مکمل طور پر عوامی تحریک تھی۔ فلسطین سے باہر تیونس میں بیٹھے ہوئے یاسر عرفات اور دیگر فلسطینی قیادت کا اس میں کوئی کردار نہ تھا۔ انتفاضہ کی تحریک کی جڑیں اسرائیل کی لامتناہی جارحیت میں پیوست تھیں۔

جب سے مصر نے اسرائیل کو تسلیم کیا تھا، اسرائیل نے مغربی کنارے (West Bank) کے اندر غیر قانونی بستیاں بنانے کا عمل بہت زیادہ تیز کر دیا تھا۔ فلسطینیوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اسرائیل مغربی کنارے اور غزہ کے فلسطینی علاقوں میں بھی زبردستی آبادی کی تبدیلی (Demographic Change) کے ذریعے یہودی اکثریت قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ ان علاقوں کو بھی ہمیشہ کے لیے ہڑپ کر لے۔ پہلی انتفاضہ کی تحریک مکمل طور پر پُرامن تھی۔ احتجاجی مظاہروں کے منتظمین نے واضح طور پر یہ ہدایات جاری کی ہوئی تھیں کہ کوئی بندوق یا دیگر اسلحہ تو درکنار، کوئی چھری یا لاٹھی بھی استعمال نہ کی جائے۔ ان احتجاجی مظاہروں کا مقصد یہ تھا کہ پوری دنیا کو اسرائیل کا بھیانک چہرہ دکھایا جائے کہ کس طرح اسرائیل کی جانب سے پُرامن مظاہروں پر گولی چلا کر سینکڑوں فلسطینیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ پہلی انتفاضہ میں 2000 سے زائد فلسطینی شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ 37000 سے زائد فلسطینی پہلے دو سالوں میں گرفتار کیے گئے اور ان کو جیلوں میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ چالیس ہزار کے قریب فلسطینی اسرائیلی فوج کی کارروائیوں میں زخمی بھی ہوئے۔ اس قدر سخت بربریت کے سامنے کچھ فلسطینی بھی صبر کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھے اور پہلی انتفاضہ کی غیر متشدد تحریک کے دوران بھی کچھ ایسے واقعات ہوئے جن میں اسرائیلیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ان واقعات میں 43 اسرائیلی

مارے گئے۔

امریکہ اور مغربی میڈیا نے حسبِ معمول سچ کو چھپانے، جھوٹ کو پھیلانے اور اسرائیل کی وکالت کرنے کا دھندا جاری رکھا۔ چند اسرائیلیوں کی موت کو مغربی میڈیا اور امریکہ نے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا، جب کہ ہزاروں فلسطینیوں کی اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں شہادت کی خبروں کو دبایا گیا۔ مگر اسرائیلی بربریت فلسطینی انتفاضہ کی تحریک کو کچلنے میں ناکام رہی، اور اسرائیلی جارحیت اور قبضے کے خلاف احتجاجی مظاہرے غزہ اور مغربی کنارے میں کئی سال تک جاری رہے۔

اگر ہم پہلی انتفاضہ کے طویل المدتی اثرات کی طرف نظر دوڑائیں تو سب سے اہم پیشرفت یہ ہوئی کہ حماس کی اسلام پسند تنظیم پہلی انتفاضہ کے دوران فروری 1988 ہی میں قائم کی گئی۔ "حماس" کی تنظیم "اخوان المسلمین" کی تنظیم سے نکلی تھی۔ شیخ یاسین، جو حماس کے بانی تھے، وہ غزہ میں اخوان المسلمین کے رہنما بھی تھے۔ 1965 سے لے کر 1988 کے دوران تئیس سالوں تک شیخ یاسین نے غزہ اور دیگر فلسطینی علاقوں میں بہت زیادہ فلاحی کام کیے تھے جن میں انہوں نے خصوصاً فلسطینیوں کی صحت اور تعلیم سے متعلق بہت سارے شفاخانے، ہسپتال اور تعلیمی ادارے قائم کروائے تھے۔ غزہ کی اسلامی یونیورسٹی بھی شیخ یاسین کی ہی کوششوں سے معرضِ وجود میں آئی تھی۔ شیخ یاسین اس بات کو سمجھتے تھے کہ جب تک قوم کی روح کے اندر اسلامی نظریات نہ اتار دیے جائیں، تب تک قوم اسرائیل کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکے گی۔ وہ سیکولر فلسطینی تنظیموں پر یہ تنقید بھی کرتے تھے کہ انہوں نے تلوار پہلے اٹھائی اور ذہن سازی کے کام پر توجہ نہ دی۔ شیخ یاسین کے مطابق فتح کی تنظیم کی اسرائیل کے ہاتھوں لبنان میں شکست کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ فلسطینی عوام کو اگر اسرائیلی جارحیت کے خلاف مؤثر طریقے سے متحرک کرنا ہے تو اس کے لیے اسلامی نظریہ ہی سب سے بہترین ثابت ہو سکتا ہے۔ شیخ یاسین کا اسلامی نظریہ ملّائیت کی بجائے سماجی انصاف پر زیادہ زور دیتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے بنوائے ہوئے ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں میں مذہب کے نام پر کسی قسم کی تفریق نہ برتی جاتی تھی۔ نتیجتاً یہاں فلسطینی عیسائیوں اور مسلمانوں

کو یکساں فائدہ حاصل تھا۔ 1988 تک شیخ یاسین اپنے پیروکاروں کو مسلح جدوجہد سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہے، لیکن پہلی انتفاضہ میں فلسطینیوں کے جوش وجذبے نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ شاید اب وقت آن پہنچا ہے کہ اسرائیلی جبر کے خلاف سیاسی اور مسلح جدوجہد شروع کر دی جائے۔ اس ضمن میں حماس کے قیام کے دو سال بعد ہی 1990 میں عزالدین القسام بریگیڈز کے نام سے حماس کا عسکری ونگ قائم کیا گیا۔

حماس کا معرضِ وجود فلسطین کی جنگِ آزادی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حماس کے منظرِ عام پر آ جانے کے بعد فلسطین کی جدوجہدِ آزادی رفتہ رفتہ سیکولر تنظیموں کے ہاتھ سے نکل کر اسلام پسند تنظیموں کے ہاتھ میں آ گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ سیکولر تنظیموں کے برعکس اسلام پسند تنظیموں کے ہاتھوں میں فلسطینی جدوجہدِ آزادی کی تحریک زیادہ مؤثر طریقے سے پھل پھول رہی ہے اور شدید اسرائیلی مظالم کے سامنے ڈٹ کر بنا ہار مانے اسرائیلی جبر وجارحیت کے خلاف بے مثال مزاحمت کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

یہاں پر یہ بات بتانا بھی بہت ضروری ہے کہ کچھ لوگ اسرائیلی پراپیگنڈہ کے زیرِ اثر آ کر یا عوام کو گمراہ کرنے کے لیے یہ افترا باندھتے ہیں کہ حماس کی تنظیم تو اسرائیل نے بنوائی تھی اور اس کا مقصد فتح کی سیکولر اور قومیت پسند تنظیم کو کمزور کرنا تھا۔ اس بات میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ اس سارے افسانے میں حقیقت کا صرف اتنا سا شائبہ ہے کہ شروع کے دنوں میں حماس کی تنظیم کو اسرائیل نے اس طرح سختی سے کچلنے کی کوشش نہیں کی تھی جیسا کہ اس نے دیگر فلسطینی تنظیموں کے ساتھ کیا تھا۔ کیونکہ کچھ اسرائیلی آفیسر یہ سمجھتے تھے کہ حماس کے منظرِ عام پہ آنے سے فلسطینی جدوجہدِ آزادی کی تحریک میں سیکولر اور اسلام پسند لوگوں کے درمیان ایک تقسیم پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جلد ہی اسرائیلی حکام کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا کہ ایسا ہونے والا نہیں ہے، بلکہ ان کو یہ لگا کہ حماس شاید سیکولر تنظیموں سے بھی زیادہ خطرناک حریف ثابت ہونے والی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جلد ہی اپنی یہ پالیسی بدل لی اور حماس کے قیام کے ایک سال بعد ہی حماس کے خلاف بدترین جارحیت کا آغاز کر دیا۔ نتیجتاً حماس کی اولین قیادت کا ایک بڑا حصہ یا تو مار ڈالا گیا یا پھر قید کر دیا گیا۔

اوسلو معاہدہ

1993 میں دنیا اس وقت حیران رہ گئی جب اچانک فلسطینی رہنما یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم یتزاک رابین کے درمیان اوسلو میں ایک معاہدہ طے پانے کی خبر منظرِ عام پر آئی۔ اوسلو معاہدے پر آج بھی کافی بحث کی جاتی ہے اور اس کو مسئلہِ فلسطین کے دو ریاستی حل کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

اوسلو معاہدے کا پس منظر کچھ یوں تھا کہ پہلی انتفاضہ کی تحریک اسرائیلی ریاست کے لیے کچھ پریشانی کا باعث بنی تھی۔ یہ بات واضح ہے کہ اسرائیل کی ناجائز ریاست اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے مغربی دنیا کی محتاج ہے۔ پہلی انتفاضہ میں اسرائیلی اور مغربی میڈیا کے پراپیگنڈے کے باوجود ساری دنیا کے لوگوں کو (جن میں یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی شامل تھے) یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اسرائیلی ریاست صرف ظلم کی اساس پر قائم ہے، جو کہ غیر مسلح اور معصوم فلسطینیوں کو کچلنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ اس وقت جنوبی افریقہ میں بھی نسلی امتیاز پر مبنی نظام (Apartheid) کے خلاف بھرپور تحریک چل رہی تھی جس کو عالمی رائے عامہ کی حمایت حاصل تھی۔ پہلی انتفاضہ نے پوری دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ فلسطین کے اندر اسرائیل نے جنوبی افریقہ سے بھی بڑھ کر بدترین نسلی امتیاز پر مبنی نظام قائم کر رکھا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر کچھ اسرائیلی سیاسی رہنما یہ چاہتے تھے کہ فلسطینیوں کے ساتھ کوئی چھوٹا موٹا معاہدہ کر لیا جائے جس سے پہلی انتفاضہ کا زور بھی کچھ کم ہو اور عالمی رائے عامہ بھی کچھ ہموار ہو جائے۔

اگر ہم فلسطینی قیادت کی بات کریں تو یاسر عرفات اس وقت شدید دباؤ میں تھے۔ 91-1990 میں سوویت یونین تحلیل ہو گئی اور اس طرح یاسر عرفات بین الاقوامی روسی طاقت کی حمایت سے محروم ہو گئے۔ اس کے علاوہ خلیج کی جنگ میں تمام عرب حکمرانوں کے برعکس یاسر عرفات نے صدام حسین کی حمایت کی تھی۔ نتیجتاً صدام حسین کی شکست کے بعد یاسر عرفات کو تمام عرب حکمرانوں کی طرف سے سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے۔ ان وجوہات کی بنا پر یاسر عرفات بھی اسرائیل سے کسی بھی قسم کا کوئی معاہدہ کرنے پر آمادہ

ہو گئے تھے۔

یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیراعظم یتزاک رابین کے نمائندوں کے درمیان ناروے (Norway) کے دارالحکومت اوسلو میں کئی ہفتے تک خفیہ بات چیت کے بعد اوسلو معاہدہ معرض وجود میں آیا۔ یہ معاہدہ ایک سراسر غیر منصفانہ معاہدہ تھا بلکہ اگر اس کو ایک اسرائیلی چال کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس معاہدے میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو تسلیم کریں گے (Mutual Recognition)۔ لیکن یہاں اہم بات یہ تھی کہ جہاں یاسر عرفات نے اسرائیل کی ناجائز ریاست کو تسلیم کیا، وہاں جواب میں اسرائیل نے فلسطینی ریاست کو نہ تو تسلیم کیا اور نہ ہی فلسطینی ریاست کو مستقبل میں بنانے کا کوئی وعدہ کیا بلکہ اسرائیل نے یاسر عرفات اور ان کی تنظیم کو فلسطینیوں کا محض نمائندہ تسلیم کیا۔ یاسر عرفات پہلے فلسطینی لیڈر تھے جنہوں نے اسرائیلی ریاست کو تسلیم کیا اور اس طرح اسرائیل سے کوئی اہم جوابی فائدہ لیے بغیر ایک اہم رعایت فراہم کردی گئی۔

اوسلو معاہدے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ فلسطینی ریاست بنانے سے پہلے ایک محدود قسم کی فلسطینی اتھارٹی بنائی جائے گی۔ فلسطینی اتھارٹی کو مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کے اندر گنجان آباد علاقوں پر ایک محدود اقتدار دیا گیا۔ اوسلو معاہدے کے تحت مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کے مقبوضہ علاقوں کو تین مختلف حصوں (Area C, Area B,Area A) میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ ایریا "سی" جس میں 70 فیصد سے زیادہ علاقہ شامل تھا، کو ابھی بھی مکمل طور پر اسرائیل کے قبضے میں برقرار رکھا گیا۔ ایریا "بی" کے اندر فلسطینیوں کو کچھ محدود اختیارات دیے گئے۔ اس کے برعکس ایریا "اے" جس میں فلسطینیوں کے گنجان آباد شہر شامل تھے، مگر علاقے کے اعتبار سے جو کل مقبوضہ علاقے کا صرف پانچ فیصد کے قریب تھا، کو تقریباً مکمل طور پر فلسطینی اتھارٹی کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔

علاقوں کی اس اسرائیلی تقسیم میں گہری اسرائیلی چال پوشیدہ تھی۔ اسرائیلی وزیراعظم یتزاک رابین کا خیال تھا کہ اس طرح وہ فلسطینی آبادی کا 90 فی صد حصہ فلسطینی اتھارٹی کے حوالے کردیں گے، جبکہ علاقے کے بہت بڑے حصے پر انہی کا قبضہ برقرار رہے گا۔ ان کا منصوبہ

یہ تھا کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقے ایریا" سی" میں مسلسل مزید غیر قانونی یہودی بستیاں بسانے کا عمل جاری رکھیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اوسلو معاہدے میں یہ بات بھی تھی کہ فلسطینی اتھارٹی اپنے زیرِ انتظام علاقوں میں حفاظتی ذمہ داریوں کے لیے مکمل طور پر جواب دہ ہوگی۔ اسرائیل نے یہ شق بھی معاہدے میں شامل کر رکھی تھی کہ اگر فلسطینی اتھارٹی اپنے علاقے میں احتجاجی کارروائیوں اور دہشت گردی کے واقعات کو قابو کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو اسرائیل پر بھی معاہدے کی پابندی لاگو نہ ہوگی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف یتزاک رابین مسلسل غیر قانونی یہودی بستیاں بسا کر فلسطینیوں کی زمین پر قبضہ کیے جا رہے تھے، دوسری طرف وہ یہ توقع بھی رکھتے تھے کہ یاسر عرفات ان یہودی بستیوں کے بننے کے خلاف فلسطینی عوام کے ردِعمل کو بزورِ بازو روکے رکھیں گے۔

اس مقصد کے لیے امریکہ کی مدد سے یاسر عرفات کو ایک پولیس فورس بھی بنا کر دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ اب فلسطینی احتجاجی مظاہروں کو کچلنے کے لیے اور فلسطینی عوام کو زدوکوب کرنے کے لیے اسرائیلی فوجیوں کی بجائے یاسر عرفات کے فلسطینی پولیس اہلکار ہی استعمال کیے جائیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب فلسطینیوں کے ہاتھ سے ہی فلسطینیوں کو مارا جائے۔ اوسلو معاہدے کے مطابق اسرائیل کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ بہت ساری بائی پاس سڑکیں بنا سکے۔ ان سڑکوں نے فلسطینی علاقوں کو گھیرے میں لے لیا جب کہ ان سڑکوں پر فلسطینیوں کو قدم دھرنے کی اجازت تک نہ تھی۔ نتیجتاً فلسطینی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جانے کے لیے بھی اسرائیلی اجازت ناموں کے محتاج ہو گئے۔ ان کی نقل و حرکت کی آزادی (Freedom of Movement) مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ عملی طور پر اوسلو معاہدے نے مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کو بہت ساری چھوٹی چھوٹی جیلوں میں تبدیل کر دیا، جن میں فلسطینی بند تھے اور جن سے وہ اسرائیل کی اجازت کے بغیر باہر نہ آ سکتے تھے۔

یہ معاہدہ سراسر غیر منصفانہ تھا اور جو لوگ دو ریاستی حل کی بات کرتے ہیں ان کو بھی یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اس معاہدے میں فلسطین کی ریاست بنانے کا کوئی اسرائیلی وعدہ تک موجود نہ تھا۔ صرف یہ اقرار کیا گیا تھا کہ اگر حالات سازگار ہوئے تو مستقبل میں فلسطینی ریاست

کے قیام کا امکان پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ اوسلو معاہدے میں فلسطینیوں کو درپیش اہم مسائل، جن میں بیت المقدس اور مشرقی القدس پر اسرائیلی قبضہ اور یہودی بستیوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد شامل تھے، پر بھی کوئی بات نہ گئی بلکہ محض یہ کہہ دیا گیا کہ ان معاملات پر بعد میں مذاکرات کیے جائیں گے اور اس طرح تاخیر کا بہانہ بنا کر بات ختم کردی گئی۔

مشہور فلسطینی تاریخ دان رشید خالدی، جو کہ اوسلو معاہدے سے قبل فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے باہمی مذاکرات میں حصہ لے چکے تھے، یہ لکھتے ہیں کہ اوسلو معاہدے کو تسلیم کرنا یاسر عرفات کی ایک سنگین غلطی تھی۔ ان کے مطابق اگر اس معاہدے کو تسلیم نہ کیا جاتا تو فلسطینیوں کے لیے حالات نسبتاً بہتر رہتے۔ لیکن اس معاہدے نے فلسطینیوں سے ان کی نقل و حرکت کی آزادی بھی چھین لی اور سب سے برا کام یہ ہوا کہ فلسطینیوں پر فلسطینیوں کے ہاتھوں تشدد کرانے کا سلسلہ بھی اسی معاہدے کے ذریعے شروع ہوا۔

اوسلو معاہدے سے جڑی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس معاہدے کے بعد اسرائیل کے موجودہ وزیر اعظم نتن یاہو (Netanyahu) نے رابین کو سیاسی نقصان دینے کے لیے یہ پراپیگنڈہ شروع کیا کہ اوسلو معاہدے کے تحت رابین فلسطینیوں کو ایک علیحدہ ریاست بنا کے دے گا۔ حالانکہ رابین کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ نتن یاہو نے رابین کو صیہونی نظریے کا غدار قرار دیا اور اسرائیلی عوام کو اس کے خلاف خوب بھڑکایا۔ نتیجتاً 4 نومبر 1995 کو ایک اسرائیلی یہودی یگال عامر (Yigal Amir) نے رابین کو قتل کردیا۔ نتن یاہو کو رابین کی موت کا کافی سیاسی فائدہ ہوا اور 1996 میں وہ پہلی بار اسرائیل کا وزیر اعظم بن گیا۔

یہاں ایک اکثر پوچھے جانے والے سوال کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ فلسطین کے مسئلے کے حل کے لیے دو ریاستی حل بہتر ہے یا ایک ریاستی حل؟ مسئلہ اصل میں دو ریاستی یا ایک ریاستی حل کا ہے ہی نہیں۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ اسرائیل کی ناجائز استعماری (Colonial) ریاست نہ ہی دو ریاستی حل کو مانتی ہے، جس کے تحت فلسطین اور اسرائیل کی دو مکمل طور پر آزاد ہمسایہ ریاستیں بنائی جائیں اور نہ ہی ایک ریاستی حل کو مانتی ہے، جس کے تحت دریائے اردن سے لے کر بحیرہ روم کے درمیان تاریخی فلسطین کی ایک ہی ریاست بن جائے،

جس میں تمام عرب اور یہودی شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ اسرائیل ایک ریاستی حل کو اس لیے نہیں مانتا کیونکہ ایسی ریاست میں عربوں کی تعداد یہودیوں سے زیادہ ہو جائے گی۔ دو ریاستی حل کو وہ اسی لیے تسلیم نہیں کرتا کیونکہ وہ فلسطینیوں کو فلسطین کی سرزمین کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دینا چاہتا۔ فلسطین سے فلسطینیوں کی مکمل نسل کشی (Genocide) صیہونیت کے نظریے کا ایک لازمی جزو ہے۔

دوسری انتفاضہ اور غزہ سے اسرائیل کا انخلا

اوسلو معاہدے اور فلسطینی اتھارٹی کے قیام کے بعد فلسطینیوں کے لیے حالات مزید خراب ہو گئے۔ فلسطینی اتھارٹی کی پولیس فلسطینیوں میں اپنے مظالم کی وجہ سے بدنام ہو گئی۔ جولائی 1997 میں جب 14 گرفتار شدہ فلسطینی پولیس کے تشدد کی وجہ سے جاں بحق ہو گئے تو غزہ کے اندر فلسطینی پولیس اور فلسطینی اتھارٹی کے خلاف شدید مظاہرے ہوئے۔

فلسطینی عوام کی اکثریت تیونس سے آئی ہوئی فلسطینی قیادت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور طنزیہ طور پر انہیں اہل تیونس کے لقب سے یاد کرتی تھی۔ ان "اہل تیونس" کی معاشرت بھی کافی حد تک یورپی معاشرت کا چربہ تھی، جس کی وجہ سے فلسطینی مسلمان ان پر خاص طور سے تنقید کیا کرتے تھے۔ غزہ کے مظلوم گرفتار شدگان کا قصور بھی صرف یہی تھا کہ ان میں سے ایک نے ایک فلسطینی "اہل تیونس" پولیس آفیسر کی بیگم کے کھلے عام نیم برہنہ لباس میں پھرنے پر اعتراض کا اظہار کیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں پولیس نے اس کو گرفتار کر لیا اور دورانِ گرفتاری اس پر اتنا تشدد کیا گیا کہ وہ جاں بحق ہو گیا۔

یاسر عرفات بھی اوسلو معاہدے کے کچھ عرصے بعد یہ بات سمجھ گئے کہ اوسلو معاہدے پر دستخط کر کے وہ ایک گہری اسرائیلی چال میں پھنس گئے ہیں۔ اسی وجہ سے جب 2000 میں امریکی صدر بل کلنٹن نے کیمپ ڈیوڈ میں یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم ایہود بارک (Ehud Barak) کے درمیان مذاکرات کروائے تو اس دفعہ یاسر عرفات مزید اسرائیلی چالوں میں نہ پھنسے۔ انہوں نے اپنا موقف واضح کر دیا کہ جب تک اسرائیل مزید یہودی بستیاں بنانا بند نہیں کرتا اور ایک فلسطینی ریاست کو تسلیم نہیں کرتا، تب تک معاملات آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہر اسرائیلی وزیر اعظم کی طرح ایہود بارک بھی کسی بھی قسم کی فلسطینی ریاست کو قبول کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھا۔ اس وجہ سے مذاکرات ناکام ہو گئے اور یاسر عرفات کیمپ ڈیوڈ سے بغیر کوئی معاہدہ کیے واپس آ گئے۔

کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کی ناکامی کے بعد اوسلو معاہدہ عملاً ختم ہوگیا، کیونکہ اوسلو معاہدے میں یہ شرط شامل تھی کہ حل طلب مسائل کو بعد میں مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے گا۔ یہ بعد میں ہونے والے مذاکرات اور ان کے ذریعے ان مسائل کا حل جو اوسلو میں زیرِ بحث نہیں آئے تھے، اوسلو معاہدے کی ایک لازمی شق کا حصہ تھے۔ اسرائیلی ہٹ دھرمی نے اوسلو معاہدے کو کیمپ ڈیوڈ میں ہی دفن کر دیا اور ستم ظریفی یہ ہے کہ الزام بھی یاسر عرفات پر لگا دیا کہ ان کی ضد کی وجہ سے مذاکرات کامیاب نہیں ہوسکے۔

یاسر عرفات کو اسرائیلی چال میں نہ پھنسنے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ نتیجتاً کیمپ ڈیوڈ کے بعد ان پر اسرائیلی سختیاں بہت بڑھ گئیں۔ ان کی زندگی کے آخری کچھ سال اسرائیلی حبسِ بے جا میں ہی گزرے، جن کے دوران عملاً وہ راماللہ (Ramallah) میں اپنے دفتر کے اندر ہی مقید ہو کر رہ گئے۔

کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کی ناکامی کے بعد وہ چند فلسطینی جو اوسلو معاہدے کی بنیاد پر کسی فلسطینی ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے، دلبرداشتہ ہوگئے۔ اب ایک بار پھر تمام فلسطینی عوام کے اندر بے چینی پیدا ہوگئی اور مزاحمت کا جذبہ بیدار ہوگیا۔ ان کے سینوں میں جو آگ سلگ رہی تھی، اس کو بھڑکانے کے لیے صرف ایک چنگاری کی ضرورت تھی اور وہ چنگاری اسرائیلی رہنما ایریل شیرون نے 28 ستمبر 2000 کو فراہم کی۔

اس دن ایریل شیرون، جو وزیراعظم کی نشست کے امیدوار ہونے کے تحت انتخابی مہم چلا رہے تھے، بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے۔ حرم شریف میں کافی دیر تک وہ اور ان کے ساتھی دندناتے ہوئے پھرتے رہے۔ اس حرکت کا مقصد صرف یہ تھا کہ فلسطینیوں کو یہ جتا دیا جائے کہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس اب صیہونیوں کے مکمل قبضے میں ہے۔

اگلے ہی دن ایریل شیرون کے اس اقدام کے خلاف فلسطین میں بے پناہ احتجاج پھوٹ پڑے۔ ان مظاہروں نے ایک ملک گیر مزاحمتی تحریک کی شکل اختیار کر لی، جس کو دوسری انتفاضہ کہا جاتا ہے۔

دوسری انتفاضہ کی تحریک پانچ سال تک جاری رہی۔ یہ تحریک مکمل طور پر غیر متشدد نہ

تھی۔ اس لیےاس میں جہاں ساڑھے پانچ ہزار فلسطینی اسرائیلی بربریت کا شکار ہو کر شہید ہوئے، وہیں گیارہ سو کے قریب اسرائیلی بھی مارے گئے۔

اسرائیلیوں کے نقصانات حماس اور اسلامی جہاد کی تنظیموں کی کارروائیوں کے نتیجے میں ہوئے۔ 2004 میں اسرائیل نے حماس کے بانی رہنما شیخ یاسین کو شہید کر دیا۔ دوسری انتفاضہ کے دوران اسرائیل نے حماس کی دیگر قیادت کو بھی نشانہ بنایا اور تقریباً تمام اعلیٰ قیادت کو شہید کر دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود حماس کی تحریک نہ صرف قائم رہی بلکہ اور بھی زیادہ مضبوط ہو گئی اور دوسری انتفاضہ میں اسرائیل کو بھاری نقصان پہنچانے میں کامیاب بھی رہی۔

2004 میں یاسر عرفات بھی جاں بحق ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں نے زہر دیا تھا۔ دوسری انتفاضہ کی تحریک 2005 تک چلی۔ یہ تحریک خاص طور پر غزہ کی پٹی میں بہت زیادہ مضبوط تھی۔ غزہ کے مسلمانوں کی بہادری سے خائف ہو کر اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون کو اس کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا کہ وہ غزہ کو خالی کر دے۔ اس وقت غزہ کے اندر کچھ اسرائیلی بستیاں بھی موجود تھیں۔

اسرائیلی فوجی اور اسرائیلی بستیوں کے شہری غزہ میں حماس کی کارروائیوں کی وجہ سے بھاری نقصان اٹھا رہے تھے اور شیرون پر 2005 تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ان بستیوں کو برقرار رکھنے کا مطلب بلاوجہ مسلسل بھاری نقصان اٹھاتے رہنا ہے۔ چنانچہ اگست 2005 میں مجبوراً ایریل شیرون نے غزہ کی پٹی کے اندر موجود اسرائیلی بستیوں کو خالی کرا لیا اور اسرائیلی فوج کو بھی غزہ سے نکال لیا۔ اب اس کا منصوبہ یہ تھا کہ غزہ کے اندر اسرائیلی فوج رکھنے کی بجائے غزہ کی پٹی کی سرحدوں پر بھاری تعداد میں فوج رکھی جائے اور غزہ کی مکمل ناکہ بندی کر دی جائے۔

غزہ میں اسرائیلی
جارحیت اور ناکہ بندی

2005 میں اسرائیل نے غزہ کو خالی تو کر دیا تھا لیکن اب امریکہ اور اسرائیل کی بھرپور کوشش تھی کہ حماس کو کسی طریقے سے دوسری فلسطینی تنظیموں کے ذریعے ہی ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے فتح کی سیکولر تنظیم کو استعمال کرنے کی کوشش کی، جس کی قیادت یاسر عرفات کے بعد محمود عباس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔

یاسر عرفات کی وفات کے بعد محمود عباس بنا کسی انتخابات کے نام نہاد فلسطینی اتھارٹی کے صدر بن گئے تھے۔ 2006 میں آخر کار پہلی دفعہ فلسطینی اتھارٹی کے تحت مقبوضہ فلسطین میں انتخابات کا انعقاد کرایا گیا۔ امریکہ اور اسرائیل نے محمود عباس کو انتخابی مہم کے لیے خطیر رقم فراہم کی اور یہی متوقع تھا کہ فتح کی تنظیم ان انتخابات میں آسانی سے کامیاب ہو جائے گی۔ اسرائیل اور امریکہ کو یہ توقع تھی کہ انتخابی کامیابی کے بعد فتح حماس کے خلاف زیادہ مؤثر ثابت ہوگی۔ لیکن جب انتخابات میں دھاندلی کی تمام کوششوں کے باوجود بھی حماس نے شاندار کامیابی حاصل کی اور 132 نشستوں کے کل ایوان میں فتح کی 45 نشستوں کے مقابلے میں 74 نشستیں جیت لیں تو اسرائیل اور امریکہ کی تمام تدبیریں الٹی ہو گئیں۔

اب اصولاً فلسطینی اتھارٹی کا وزیر اعظم حماس کی طرف سے ہونا چاہیے تھا، جس نے اسماعیل ہانیہ کو اس منصب کے لیے نامزد کر دیا۔ مگر اسرائیل اور امریکہ نے یہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ حماس کو ایک دہشت گرد تنظیم مانتے ہیں اور انہوں نے فتح پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ حماس کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون نہ کرے۔ حماس نے فلسطینی یکجہتی کے نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے اکثریت میں ہونے کے باوجود فتح کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور پیشکش کی کہ فتح اور حماس مل کر حکومت بناتے ہیں۔ فتح کے حامیوں کی اکثریت اس پیشکش کو قبول کرنے کے حق میں تھی، لیکن فتح کے سربراہان نے امریکی دباؤ کے سبب اس پیشکش کو رد کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ یہ پیشکش قبول کر لیتے تو انہیں امریکہ اور اسرائیل کی دشمنی مول لینی پڑتی اور امریکی ڈالرز کی وجہ

سے ان کی جو شاہانہ اور پُرتعیش زندگی بسر ہو رہی تھی، اس میں خلل کا اندیشہ تھا۔ حماس کے ساتھ مل کر اسرائیلی استعمار کا مقابلہ کرنے کے بجائے فتح کے سربراہان نے حماس سے جنگ کرنے کی ٹھان لی۔ اگرچہ حماس امریکہ اور اسرائیل کی وجہ سے مغربی کنارے میں انتخابات میں کامیاب ہونے کے باوجود حکومت میں نہ آسکی تھی، لیکن غزہ کی پٹی میں حماس بہت زیادہ مضبوط تھی۔

غزہ کی پٹی کے اندر حماس کی جڑ کاٹنے کے لیے فتح کے ایک رہنما محمد دحلان کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ غزہ سے حماس کا صفایا کرے۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس کو امریکہ اور اسرائیل کی طرف سے کافی سارا اسلحہ بھی دیا گیا۔ امریکہ اور اسرائیل کو یہ توقع تھی کہ دحلان کی فورسز، جن کے پاس اچھا اسلحہ بھی تھا، حماس کے گوریلوں کے مقابلے میں فتح یاب ٹھہریں گی۔ لیکن ایک بار پھر ان کی امیدیں دھری کی دھری رہ گئیں جب 2007 میں حماس کے گوریلوں نے محمد دحلان اور اس کے کرائے کے سپاہیوں کا غزہ سے صفایا کر دیا۔ نتیجتاً محمد دحلان غزہ سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔

فلسطینی کٹھ پتلیوں کی ناکامی اور شکست کے بعد اب امریکہ اور اسرائیل کے پاس یہی راستہ بچا تھا کہ وہ خود حماس کے خلاف کارروائیاں شروع کریں۔ چنانچہ 2007 میں اسرائیل نے غزہ کی پٹی کی سخت ناکہ بندی کر دی، اشیائے خورد و نوش اور ادویات کی منتقلی پر بھی سخت پابندیاں لگا دیں اور اس طرح غزہ کو دنیا کی سب سے بڑی جیل میں تبدیل کر دیا۔ 2007 سے لے کر 2023 تک 16 سال اہلِ غزہ نے انتہائی سختی اور بدحالی کے عالم میں کاٹے۔ غزہ کی آدھی سے زیادہ آبادی غربت اور خوراک کی کمی (Malnutrition) کا شکار ہو گئی۔ 52 فی صد نوجوان غزہ میں بے روزگار تھے۔

اسرائیل نے صرف ناکہ بندی پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ بارہا غزہ پر حملے بھی کیے۔ 2008، 2012، 2014، اور 2021 میں غزہ پر اسرائیل نے انتہائی خونریز حملے کیے جن میں چھ ہزار سے زائد فلسطینی شہید ہوئے۔ اسرائیل اس عرصے میں غزہ کو اپنے ہتھیاروں کی صنعت کے لیے ایک لیبارٹری کے طور پر تجربات کے لیے استعمال کرتا رہا، جہاں ہر نئے تیار ہونے والے ہتھیار کا تجربہ کیا جاتا رہا۔ غزہ کی فلسطینی قیادت نے پُرامن احتجاجی مظاہروں کا

راستہ اپنایا اور 19۔2018 میں ہزاروں کی تعداد میں فلسطینیوں نے غزہ کی سرحدوں پر جا کر اسرائیلی ناکہ بندی کے خلاف احتجاج کیا۔ جواب میں اسرائیلی فوج نے فائر کھول دیا اور سینکڑوں فلسطینیوں کو شہید کر دیا۔

اس طرح اسرائیل نے امریکی حمایت کے ساتھ ساری دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ غزہ کے لوگوں کے لیے پُرامن احتجاج بھی برداشت نہ کیا جائے گا اور ان کو رفتہ رفتہ ناکہ بندی کے ذریعے گلا گھونٹ کر مارا جائے گا تاکہ بالآخر فلسطینیوں کو غزہ خالی کرنا پڑ جائے، غزہ میں نسل کشی (Genocide) مکمل ہو جائے، اور اسرائیل کو فلسطین کے اس ٹکڑے پر بھی قبضہ کرنے کا موقع مل جائے۔ 2023 تک اسرائیل اور امریکہ اپنی اس حکمتِ عملی پر بڑے مسرور تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کی حکمتِ عملی رفتہ رفتہ کامیاب ہو رہی ہے۔

7۔اکتوبر 2023:طوفان الاقصٰی

7 اکتوبر 2023 کو اسرائیل کی ناجائز استعماری ریاست کو اپنی تاریخ کا سب سے بڑا دھچکا لگا، جب اچانک حماس، اسلامی جہاد اور دیگر فلسطینی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے فلسطینی گوریلے غزہ سے نکلے اور اسرائیل پر حملہ آور ہو گئے۔ اسرائیلی جرنیلوں اور حکمرانوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ فلسطینی ان پر اس طرح کی ایک ضرب لگا سکتے ہیں۔ اسرائیلیوں کو اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور تکبر کی خاطر خواہ قیمت ادا کرنا پڑی۔ 7 اکتوبر کے فلسطینی حملے میں تقریباً 1139 اسرائیلی ہلاک ہوئے اور 250 کے قریب اسرائیلیوں کو قیدی بنا کر غزہ لے جایا گیا تا کہ بعدازاں ان کے عوض ان ہزاروں بے گناہ فلسطینی قیدیوں کو چھڑایا جا سکے جو اسرائیلیوں نے حبسِ بے جا میں رکھے ہوئے تھے۔ نتیجتاً اسرائیلی فوج مکمل طور پر بدحواسی کا شکار ہو گئی اور کئی دن تک فلسطینی گوریلے اسرائیل کے اندر کارروائیاں بھی کرتے رہے۔

7 اکتوبر کے فاتحانہ آپریشن کا نام فلسطینیوں نے طوفان الاقصٰی رکھا تھا، جو کہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی آزادی تک فلسطینی چین سے نہ بیٹھیں گے۔ طوفان الاقصٰی کی کامیابی کی کئی وجوہات تھیں لیکن سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ اسرائیلیوں نے اپنی فوجی طاقت کے تکبر اور غرور میں اس بات کو ممکن ہی نہیں سمجھا تھا کہ فلسطینی بھی ان پر کسی طرح کا کوئی کارآمد حملہ کر سکتے ہیں۔ اس حملے کی تیاری کئی سالوں پر محیط تھی۔ اس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ قیادت تو بلاشبہ حماس نے کی اور فلسطین کی سب سے زیادہ شہرت یافتہ تنظیم ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں میں زیادہ مجاہدین حماس ہی کے شامل تھے، لیکن تقریباً تمام فلسطینی تنظیموں نے اس میں حصہ لیا، جن میں دیگر سیکولر تنظیمیوں کے علاوہ "اسلامی جہاد" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ چنانچہ فلسطینیوں کا باہمی اتحاد بھی اس آپریشن کی کامیابی کی ایک بہت بڑی وجہ تھا۔

آپریشن طوفان الاقصیٰ کی کامیابی کے بعد ناجائز اسرائیلی ریاست کی حالت بالکل ایک باؤلے کتے جیسی ہو گئی اور اسرائیل نے غزہ میں نہایت بے دردی سے فلسطینیوں کا قتل عام کرنا شروع کر دیا۔ حماس اور اسلامی جہاد کی افواج جن کو بالترتیب "عزالدین القسام بریگیڈز"

اور" القدس بریگیڈز" کہا جاتا ہے، اسرائیل کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوئیں۔ اسرائیل نے ہزاروں کی تعداد میں اپنے فوجی غزہ کے اندر داخل کر دیے اور ہر روز سینکڑوں جہازوں کے ذریعے غزہ پر بم باری کی۔ اب تک محتاط اندازوں کے مطابق غزہ پر اتنی بم باری کی جا چکی ہے جتنی جنگ عظیم دوم میں تمام ممالک نے مل کر بھی ایک دوسرے پر نہیں کی تھی لیکن اس کے باوجود عزالدین القسام بریگیڈز اور القدس بریگیڈز نہ صرف میدان میں موجود ہیں بلکہ آئے روز اسرائیلی فوجیوں کو اپنی کامیاب کارروائیوں میں جہنم واصل بھی کرتے رہتے ہیں۔

گوریلا جنگ کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فلسطینی مجاہدین غزہ کے نیچے کھودی گئی بے شمار سرنگوں کا فائدہ اٹھا کر اسرائیلی افواج کو انتہائی غیر متوقع مقامات اور اوقات میں نشانہ بناتے ہیں اور اسرائیلی افواج کے ہاتھ لگے بغیر دوبارہ اپنی سرنگوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔

اسرائیلی فوج فلسطینی مجاہدین کی اس جنگی تکنیک سے بے بس ہو کر طیش میں آ جاتی ہے اور اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے عورتوں، بچوں اور عام عوام کا قتلِ عام کرتی ہے اور شہری آبادیوں پر کھل کر بم باری کرتی ہے۔ اسرائیلی بربریت کے نتیجے میں اب تک 65 ہزار سے زائد فلسطینی شہید ہو چکے ہیں جبکہ بہت ساری لاشوں کے ملبے تلے دبے ہونے کی وجہ سے اس اندازے میں اضافے کا قوی امکان بھی موجود ہے۔ اسرائیل غزہ پر مسلسل بم باری کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں اشیائے خورد و نوش کی فراہمی کو روک کر قحط کی صورت حال بھی پیدا کر چکا ہے، جس کی وجہ سے 20 لاکھ فلسطینی نہایت کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان تمام مظالم کے باوجود فلسطینیوں کے پائے استقامت میں ذرا برابر بھی لغزش نہیں آئی اور اسرائیل کا یہ منصوبہ کہ فلسطینیوں کے لیے ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ غزہ کو چھوڑ کر نکل جائیں کسی بھی طرح پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا۔

اگر جنگی صورت حال کی بات کی جائے تو اسرائیلی فوج ابھی تک حماس اور اسلامی جہاد کو کچلنے میں مکمل طور پر ناکام رہی ہے۔ اگست 2024 میں نتن یاہو نے دعویٰ کیا کہ حماس کی شکست بالکل قریب ہے۔ لیکن امریکی خبر رساں ادارے سی این این {CNN (جو اسرائیل کا بڑا حمایتی ہے)} نے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے ایک تفتیشی رپورٹ شائع کی جس میں

بتایا گیا تھا کہ حماس کی عزالدین القسام بریگیڈز کی 21 بٹالینز میں سے اسرائیل محض تین بٹالینز کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوا ہے، جبکہ 18 بٹالینز ابھی بھی اسرائیل کے خلاف برسرِ پیکار ہیں اور حماس کی طرف سے اُن تین بٹالینز کی بھی دوبارہ بحالی کا عمل تیزی سے جاری ہے۔

محتاط اندازوں کے مطابق 65 ہزار فلسطینی شہدا میں سے محض 10 فی صد کے قریب ہی فلسطینی گوریلے ہیں جبکہ شہدا کی بقیہ تعداد عام شہریوں پر مشتمل ہے۔ دوسری طرف اگر ہم اسرائیل کے نقصانات کا ذکر کریں تو اسرائیلی حکومتی اعداد وشمار کے مطابق ابھی تک اس جنگ میں تقریباً دو ہزار اسرائیلی مارے جا چکے ہیں، جن میں اسرائیل کے مطابق ایک ہزار سے کچھ اوپر فوجی ہیں بلکہ باقی عام شہری ہیں۔ یہاں بھی اسرائیل نے غلط بیانی سے کام لیا لیکن اس کے جھوٹ بے نقاب بھی ہو گئے ہیں۔

جہاں تک عام شہریوں کا تعلق ہے تو اسرائیل فلسطین کی طرح نہیں ہے۔ اسرائیل میں لازمی فوجی سروس ہے، جس کے تحت ہر مرد اور عورت کو فوجی تربیت بھی حاصل کرنی پڑتی ہے اور زندگی کے کئی سال فوج میں خدمات بھی سرانجام دینی پڑتی ہیں۔ فوج سے نکلنے کے بعد بھی ان لوگوں کو ریزرو (Reserve) فوجی سمجھا جاتا ہے اور اسرائیلی حکومت کسی بھی وقت ان کو فوجی خدمات کے لیے دوبارہ طلب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اسرائیل میں عام شہری صرف وہی ہیں جو یا تو بوڑھے ہیں یا بچے ہیں۔ پورا اسرائیل ایک بہت بڑا فوجی کیمپ ہے جس کے ہر مرد اور عورت کو فوجی تربیت بھی حاصل ہے اور ان کی اکثریت ہر سال کچھ مہینے فوج میں لازمی طور پر خدمات بھی سرانجام دیتی ہے۔ طوفان الاقصیٰ میں مارے جانے والے "عام اسرائیلی شہریوں" کی اکثریت بھی انہی ریزرو فوجیوں پر مشتمل تھی۔

دوسرا جھوٹ اسرائیلی فوجیوں کی اموات کی تعداد سے متعلق ہے۔ اعلانیہ طور پر تو اسرائیل یہ کہتا ہے کہ اس کے صرف ایک ہزار فوجی مارے گئے ہیں، جبکہ اسرائیل کے چیف آف جنرل سٹاف ایبال زمیر (Eyal Zamir) نے فروری 2025 میں ایک اسرائیلی خبر رساں ادارے کو انٹرویو دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ 5942 اسرائیلی خاندان ایسے ہیں جن کے افراد اس جنگ میں مارے جا چکے ہیں اور 15 ہزار اسرائیلی فوجی شدید زخمی ہیں جن کو مسلسل طبی

امداد کی ضرورت ہے۔ اسرائیل جیسے چھوٹے ملک کے لیے، جس میں یہودیوں کی کل آبادی 70 لاکھ کے لگ بھگ ہے، یہ ایک بہت بڑا جنگی نقصان ہے۔ اگر ایال زمیر کی بات کو درست مانا جائے تو اسرائیلی فوج کے ہلاک شدگان اور زخمیوں کی تعداد 21 ہزار سے زائد ہے۔ ان نقصانات کی شدت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ 20 سالہ ویت نام جنگ میں، جس میں امریکہ کو شکست ہوئی، امریکہ کے کل 60 ہزار فوجی مارے گئے۔ اگر تناسب نکالا جائے تو ہر سال اوسطاً 3000 امریکی فوجی مارے گئے۔ اس کے مقابلے میں ڈیڑھ سال کے عرصے میں اسرائیل کے تقریباً 6 ہزار کے قریب فوجی مارے گئے اور اس طرح ایک سال میں اوسطاً 4 ہزار فوجی مارے گئے۔ اگر ان دونوں جنگی نقصانات کا تقابلی جائزہ کیا جائے تو یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسرائیل کو کس قدر شدید جنگی نقصان پہنچا ہے۔

اب تو صورت حال یہ ہے کہ اسرائیلی جرنیل بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ حماس کو میدان جنگ میں شکست دینا ناممکن ہے اور اکثر جرنیلوں کا یہ کہنا ہے کہ اس جنگ کو نتن یاہو صرف سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے طول دے رہا ہے کیونکہ عدالتوں میں اس کے خلاف بہت سارے بدعنوانی (Corruption) کے مقدمات درج ہیں اور جنگ کے خاتمے پر اسرائیل میں قومی اتحاد کی حکومت بھی ختم ہو جائے گی۔ نتیجتاً نتن یاہو کو اپنے جرائم کا حساب دینا پڑے گا۔

اسی وجہ سے نتن یاہو اپنی وزارت عظمیٰ کو طول دینے کے لیے اور اپنے سیاسی مفادات کو حاصل کرنے کے لیے آئے دن فلسطینیوں پر بمباری کیے جا رہا ہے، جبکہ عملاً اسرائیلی فوج جنگ سے معذور ہو چکی ہے اور جب بھی وہ حماس کے خلاف کوئی خاص کارروائیاں کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں پر انسانی حقوق کا دم بھرنے والے مغربی منافقوں پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ساری دنیا کے سامنے اسرائیل کا خونخوار وزیر اعظم نتن یاہو صرف اپنی سیاست چمکانے کے لیے ہر روز بے گناہ فلسطینیوں کی لاشیں گرا رہا ہے، لیکن اقوام عالم کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مسلمان ممالک بے غیرتی اور بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، جب کہ مغربی ممالک اسرائیل کو ہر طرح کی جنگی حمایت فراہم کر رہے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ مغربی ممالک کی نظر میں انسانی حقوق کے حق دار صرف سفید چمڑی رکھنے والے ان

کے اپنے ہی لوگ ہیں۔ اس کے علاوہ باقی دنیا میں بسنے والے انسانوں کو تو وہ انسان ہی نہیں مانتے اور نتیجتاً ان کے انسانی حقوق کی کوئی بات بھی نہیں کرتے۔

مسئلہِ فلسطین اور صیہونیت کا مختصر تجزیہ

اب جبکہ ہم نے مسئلہِ فلسطین کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی ہے،تو ہم اس تاریخ کا ایک مختصر سا تجزیہ پیش کرنا چاہیں گے۔اگر مسئلہِ فلسطین کو بغور دیکھا جائے تو اس میں سات اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

1۔صیہونیوں کا حد سے بڑھا ہوا تکبر (Hubris)

صیہونی یہودیوں کو یہ زعم ہے کہ وہ خدا کے چنے ہوئے لوگ ہیں (Chosen people) ،خدا نے ان کو قیامت تک کے لیے فلسطین کی سرزمین ودیعت کردی ہے اور جو کوئی بھی سرزمینِ فلسطین پر ان کی اجازت کے بغیر رہ رہا ہے،اس کو، بحیثیت دنیا کی بہترین قوم (Superior Race) ،وہ مارنے یا نکالنے کا مکمل حق رکھتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر صیہونی یہودی اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں اور یہودی مذہبی کتابوں اور احکامات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن یہی سیکولر یہودی ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ خدا نے انہیں دنیا کی افضل ترین نسل بھی بنایا اور فلسطین کی زمین بھی ان کے نام کردی ہے۔ صیہونیوں کا یہ حد سے بڑھا ہوا تکبر ،دنیا کی تمام دوسری قوموں کے لیے ان کے دلوں میں نفرت پیدا کرتا ہے اور اسی نفرت سے ہی مسئلہِ فلسطین جیسے خوفناک المیے جنم لیتے ہیں۔

2۔صیہونیوں کی ہٹ دھرمی:

صیہونی قریباً سو سال سے فلسطین کے اندر فلسطینیوں کی نسل کشی (Genocide) کر رہے ہیں اور انہیں مارنے یا نکالنے کی کوشش کررہے ہیں،لیکن آج تک کامیاب نہیں ہو پائے۔ اب بھی ارضِ فلسطین میں (دریائے اردن اور بحیرہ روم کے درمیان والا علاقہ) اگر ستر لاکھ صیہونی یہودی ہیں تو ستر لاکھ فلسطینی عرب بھی موجود ہیں۔اس کے علاوہ کروڑوں کی

تعداد میں فلسطینی، جو کہ 1948 اور 1967 میں نکالے گئے اور ان کی اولادیں، اردگرد کے ممالک میں پناہ گزین ہیں۔

اب تو بہت سارے اسرائیلی یہودی بھی یہ ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ فلسطینیوں کو فلسطین سے نکالنے کا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے اور اگر اسرائیل کی ریاست نے قائم رہنا ہے تو اسے چاہیے کہ فلسطینیوں سے کوئی امن کا معاہدہ یا لین دین کا معاملہ کر لے جس کے نتیجے میں فلسطینیوں کو بھی کچھ مل جائے اور اسرائیل کی ریاست بھی قائم رہ جائے لیکن صیہونیت کے نظریے کو ماننے والے یہودی اس بات کے مکمل طور پر انکاری ہیں اور جس طرح جرمنی کے نازی قائد ہٹلر کا کہنا تھا کہ مشرقی یورپ میں یا تو جرمنوں کی افضل نسل رہے گی یا سلاوز (Slavs) کی کمتر نسل رہے گی، اسی طرح صیہونی یہودیوں کی یہ ہٹ دھرمی بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ فلسطین میں یا تو وہ رہیں گے یا فلسطینی۔ اس وجہ سے مسلسل خون بہ رہا ہے اور جنگ چل رہی ہے۔ جب کہ اس وقت اسرائیل کے پاس بہترین موقع ہے کہ وہ فلسطینیوں کو فلسطین کا صرف بیس فی صد (غزہ کی پٹی، مغربی کنارہ اور مشرقی القدس) علاقہ فلسطینی ریاست کی صورت میں دے کر راضی کر سکتا ہے اور اس طرح 80 فی صد فلسطین پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتا ہے لیکن صیہونی ہٹ دھرمی اس امر کی راہ میں مانع ہے۔

3۔صیہونیوں کا نفسیاتی عدم تحفظ (Insecurity):

تعجب کی بات لگتی ہے کہ اسرائیل کی صیہونی ریاست، جس کے پاس دنیا جہان کے بہترین اسلحے سے لیس دنیا کی طاقت ور ترین فوجوں میں سے ایک فوج موجود ہے، نفسیاتی عدم تحفظ کا شکار ہو؛ لیکن حقیقتاً ایسا ہی ہے کہ ایک طرف تو صیہونی اپنے تکبر میں اتنے غرق ہیں کہ کسی کو اپنے برابر کا سمجھتے ہی نہیں (اس میں ان مغربی ممالک کی قومیں بھی شامل ہیں جوان کو اسلحہ، پیسے اور میڈیا کے ذریعے مکمل حمایت فراہم کر رہی ہیں) اور اپنے آپ کو افضل ترین اور بہترین قوم سمجھتے ہیں، جب کہ دوسری طرف وہ ہر وقت اس ڈر میں گرفتار رہتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی ان کو مار دے گا یا ان پر ضرب لگائے گا اور ہر لمحہ اسی خوف کے عالم میں بسر کرتے ہیں۔

پہلے وہ متکبرانہ ذہنیت اورہٹ دھرمی کی پالیسی کے تحت فلسطینیوں پر بے پناہ مظالم کرتے ہیں، پھر جب فلسطینی مزاحمت کرتے ہیں اوراسرائیلیوں کا کچھ نقصان ہوتا ہےتو وہ فوراً نفسیاتی عدم تحفظ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اسرائیل کی صیہونی قوم ایک شدید نفسیاتی بیماری (Dissociative Disorder) کا شکار ہے اوراس کو یہ دکھائی ہی نہیں دیتا کہ اس کے اپنے تکبراوراپنے اعمال ہی کی وجہ سےاس میں یہ عدم تحفظ کی کیفیت رونما ہوئی ہے۔ جیسے ایک Dissociative Disorder کا شکارمریض اپنے اعمال اوران کے نتائج کے مابین رابطہ قائم کرنے میں ناکام رہتا ہےاوراسی وجہ سے اسے کسی ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کرا کے اس کا علاج کرانا پڑتا ہے، اسی طرح صیہونی قوم بھی اس صلاحیت سے عاری ہے کہ وہ اپنے اعمال اوران کے نتائج کے مابین منطقی وعقلی رابطہ تلاش کر کے اپنی تصحیح کر سکے۔

اس کے ساتھ ساتھ صیہونی قوم کواجتماعی ہیجان(Collective Hysteria) کا مرض بھی لاحق لگتا ہے۔ کیونکہ جہاں بھی فلسطینیوں کا کوئی ذکرآئےتو یہ قوم اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتی ہےاورکسی جنون زدہ مریض کی طرح چیخنا چلانا شروع کر دیتی ہے۔اس سلسلے میں پچھلے ہی سال ایک مثال دیکھی گئی کہ اولمپک دیکھنے آئے اسرائیلی ناظرین کابرتاؤاتنا زیادہ ناگوارتھا کہ عام لوگ جنہیں مسئلۂ فلسطین میں کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ بھی ان اسرائیلی سیاحوں کودیکھ کر" فلسطین کوآزادی دو" (Free Palestine) کے نعرے لگاتے ہوئے دکھائی دیے۔ نازی جرمنوں کی طرح اسرائیلی صیہونی بھی شدید اجتماعی ذہنی امراض کا شکار ہیں اوران اجتماعی ذہنی امراض کی وجہ ہی سے فلسطین آگ اورخون کے سیلاب میں ڈوب چکا ہےلیکن اسی سبب پوری دنیااوراسرائیلی صیہونیت کے درمیان نفرت بڑھتی جارہی ہےاوراسرائیل اپنے مظالم کی بدولت نازیوں کی طرح اپنے منطقی انجام اورمکمل تباہی کی طرف رواں ہے۔

4۔مغربی سامراج (Western Imperialism) اوراسلام دشمنی(Islamophobia)

اسرائیل کی ناجائز ریاست اور صیہونی نظریہ کبھی بھی فلسطین میں پنپ نہ سکتے اگر انہیں مغربی سامراج کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ یہ بات تو طے ہے کہ اسرائیل مغرب کی معاشی اور فوجی حمایت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور جس دن مغرب نے اسرائیل کی حمایت سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا، اس دن اسرائیل کا مزید برقرار رہنا مشکل ہو جائے گا۔ البتہ مغربی سامراج اسرائیل کی حمایت ترک نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب مسلسل عالمِ اسلام کو اپنے نئے سامراجی پنجے (Neocolonialism) میں جکڑ کر رکھنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے ہی اس نے اسرائیل کا صیہونی خنجر عین اسلامی دنیا کے قلب میں اتارا ہے تا کہ وہ اسلامی دنیا میں انتشار کا بیج بوتا رہے، مسلمان قوم ہمیشہ کمزوری کا ہی شکار رہے اور نئے مغربی سامراج کی مزاحمت نہ کر سکے۔

دوسری وجہ مغرب کی اسلام دشمنی (Islamophobia) ہے۔ مغرب کو صدیوں سے اسلام دشمنی کا جو سبق پادریوں کے ذریعے سے پڑھایا گیا تھا، وہ پادریوں کے سیاسی میدان سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی مغربی اذہان سے محو نہیں ہو پایا۔ مغرب میں پرچار تو سیکولرزم کا کیا جاتا ہے، لیکن عملاً تمام مغربی ممالک اسلام دشمنی کی بیماری میں سرتاپا مبتلا ہیں اور مسلمانوں کی ثقافتی، مذہبی اور معاشی آزادی پر ضرب لگانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسرائیل چونکہ اسلام دشمنی کے میدان میں مغرب کا پکا حمایتی ہے، اس لیے بھی مغرب اسرائیل کی کسی بھی طرح کی حمایت میں پیچھے رہنا گوارا نہیں کرتا۔

5۔ صیہونی اس دور کے نازی ہیں۔

نازی جرمنی ایک ایسا ملک تھا جو نسلیت پرستی، نفرت اور جارحیت کے نظریے پر قائم ہوا اور جس کی پالیسی دوسرے ممالک پر قبضہ، ان کے عوام کا قتلِ عام اور نسل کشی (Genocide) رہی۔ اگر ہم اسرائیل کی ناجائز صیہونی ریاست پر نظر ڈالیں تو اس کا نظریہ بھی نفرت، نسل پرستی اور جارحیت پر مبنی ہے اور وہ بھی جہاں تک ہو سکے قبضہ، قتلِ عام اور نسل کشی (Genocide) کی ہی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ نازی جرمنوں اور صیہونیوں کے درمیان صرف ایک فکری رابطہ ہی نہیں بلکہ ایک بلاواسطہ تعلق بھی ہے۔ 1930 کی دہائی میں

جب جرمن نازی یہودیوں کے خلاف قوانین ترتیب دے رہے تھے، تو اس وقت نازیوں اور صیہونی تحریک کے درمیان ایک سمجھوتہ طے پایا تھا۔ اس سمجھوتے کی بنیاد یہ تھی کہ نازی چاہتے تھے کہ یہودی جرمنی سے نکل جائیں جبکہ صیہونی چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ یہودی فلسطین میں لائے جائیں۔ چنانچہ نازیوں نے صیہونی تحریک کی حمایت شروع کی اور بہت سارے صیہونی یہودیوں کو تربیت دے کر فلسطین میں بھیجا تاکہ صیہونی منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاسکے۔ اس طرح تاریخ کے ایک موڑ پر نازی اور صیہونی تحریکیں ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتی ہوئی دکھائی دیں۔

نازیوں اور صیہونیوں کے اس گٹھ جوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1933 اور 1935 کے دو سالوں کے درمیان فلسطین کے اندر صیہونی آبادی دگنی ہوگئی۔ نازیوں کے خاتمے کے بعد صیہونی تحریک نے ان کا چھوڑا ہوا قتلِ عام اور نسل کشی (Genocide) کا پرچم اپنے ہاتھ میں تھاما۔

6۔ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مسئلہِ فلسطین کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چاہے آپ حق پر ہی کیوں نہ ہوں، فتح حاصل کرنے کے لیے آپ کو طاقت چاہیے۔ اگر مسلمان متحد اور طاقت ور ہوتے، تو پہلے برطانوی اور بعد میں صیہونی کبھی بھی فلسطین پر قابض ہو کر اس کو اپنے شیطانی عزائم کی جولاں گاہ نہ بنا سکتے۔ مسئلہِ فلسطین کی تاریخ سے ہمیں یہ سبق لازمی لینا چاہیے، جو علامہ اقبال نے بھی ہمیں بتایا تھا، کہ حق کے ساتھ جب تک طاقت بھی ہاتھ میں نہ ہو عملی اہداف اور عملی کامیابی حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔

وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا استَطَعتُم مِّن قُوَّةٍ وَّمِن رِّبَاطِ الخَيلِ تُرهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُم وَاٰخَرِينَ مِن دُونِهِم لَا تَعلَمُونَهُمُ اَللّٰهُ يَعلَمُهُم وَمَا تُنفِقُوا مِن شَیءٍ فِی سَبِيلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيكُم وَاَنتُم لَا تُظلَمُونَ (سورۃ الانفال، آیت 60)

"اور تیار رکھو ان کے (مقابلے کے) لیے اپنی استطاعت کی حد تک طاقت اور بندھے

ہوئے گھوڑے (تاکہ) تم اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ڈراسکو اور کچھ دوسروں کو (بھی) جو ان کے علاوہ ہیں تم انہیں نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے اور جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا ثواب پورا پورا تمہیں دیا جائے گا اور تم پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔"

گفت اگر از راز من داری خبر
سوی این شمشیر و این قرآن نگر
این دو قوت حافظ یک دیگرند
کائنات زندگے را محورند

"اگر آپ میری زندگی کا راز جاننا چاہتے ہیں تو میری تلوار اور قرآن پاک پر نگاہ ڈالیں۔ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں۔ زندگی کی کائنات انہی دو کے گرد گھومتی ہے"۔
(اقبال)

7- اسلامی نظریے کا مکمل نفاذ اور اتحادِ امت

مسئلہِ فلسطین کے حل کی دو چابیاں ہیں۔ ایک اسلامی نظریے کا مکمل نفاذ اور دوسرا اتحادِ امت۔ جب ہم اسلامی نظریے کی بات کرتے ہیں تو اس سے بنیادی طور پر مراد اسلامی سماجی انصاف کا نظریہ ہے۔ جب تک مسلمان اپنے درمیان سماجی انصاف قائم نہ کریں گے، تب تک کمزور ہمیشہ طاقت ور کا شکار رہے گا جیسے ایک چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی کے منہ کا نوالہ بن جاتی ہے اور ناانصافی کا دور دورہ رہے گا۔ نتیجتاً قوم کبھی بھی اتنی طاقت پیدا ہی نہیں کر سکے گی کہ وہ صیہونیوں اور مغربی سامراج جیسے خوف ناک اور بڑے دشمن کا مقابلہ کر سکے۔ حماس کی داستان سے ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ چند لاکھ فلسطینیوں میں اسلامی نظریے کی بنیاد پر حماس نے سماجی انصاف قائم کر کے تمام فلسطینیوں کو مذہب اور قبیلے سے بالاتر ہو کر اس بات پر متفق اور متحرک کر دیا کہ وہ فلسطین کی جدوجہدِ آزادی میں اپنے تن، من، دھن کی بازی لگا دیں۔

اگر اتحاد کی بات کی جائے تو یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی اور اندرونی غداریوں کی وجہ سے ہی فلسطین پہلے برطانوی اور پھر صیہونی قبضے میں چلا گیا۔

اگر مسلمان کبھی بھی اسلامی نظریے پر متحد ہو کر صیہونیوں کا مقابلہ کرتے تو انہیں بالکل اسی طرح شاندار فتح حاصل ہوتی جیسے صلاح الدین ایوبی کو صلیبیوں کے خلاف ہوئی تھی۔

یادرہے کہ صلیبیوں کو بھی مسلمانوں کی آپس کی نااتفاقی سے ہی ابتدائی فتوحات حاصل ہوئی تھیں اوراس کے بعد اتحاد بین المسلمین کے ذریعے سے ہی صلیبیوں کو شکست دی جاسکی تھی۔ اسی طرح مسئلہِ فلسطین کے حل کے لیے بھی ضروری ہے کہ بنگلہ دیش اور پاکستان سے لے کر مراکش تک کے مسلمان اتحاد قائم کریں اور صیہونی منصوبے کے خلاف یک جان ہو کر مزاحمت کی روح پیدا کریں۔ صرف اسی صورت میں ہی حقیقی فتح ممکن ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

پاکستان کو فلسطین کی حمایت کیوں کرنی چاہیے؟

پاکستان میں بھی اب ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چلا ہے جو یہ بات کرتا ہے کہ پاکستان کو فلسطین کی حمایت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ لوگ بعض اوقات ایسے سوالات بھی اٹھاتے ہیں کہ فلسطین نے پاکستان کے لیے کیا کیا ہے یا عربوں نے پاکستان کے لیے کیا کیا ہے؟ اس طبقے میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ پاکستان کو چاہیے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کر لے اور اسرائیل سے اچھے تعلقات استوار کر لے۔ ان کا خیال ہے کہ اسرائیل کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کر کے پاکستان کو فائدہ ہوگا۔ درست بات یہی ہے کہ ایسے لوگ مغرب کے زرخرید غلام ہیں اور یہ لوگ اس طرح کا پروپیگنڈہ صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کو مغرب سے یا تو مالی فوائد حاصل ہو رہے ہیں یا پھر ہونے کی توقع ہے۔ اگر ہم اس موضوع کا ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کو فلسطین کی حمایت تین وجوہات کی بنا پر کرنی چاہیے:

پہلی وجہ تو تاریخی اور نظریاتی ہے۔ فلسطین کی حمایت تو علامہ اقبال اور قائداعظم اس وقت سے کر رہے ہیں جب پاکستان بنا ہی نہیں تھا بلکہ پاکستان کی تحریک چل رہی تھی۔ علامہ اقبال اور قائداعظم نے یہ بات واضح کی تھی کہ پاکستان کی ریاست کا مقصد یہی ہے کہ یہ عالمِ اسلام کی ایک ہراول دستے کی ریاست بنے گی اور پوری دنیا میں جہاں بھی مسلمان مشکل میں ہوں گے ان کی مدد کرے گی۔ اُس وقت بھی فلسطین میں برطانوی راج اور صیہونیوں کی چکی تلے فلسطینی مسلمان سخت پس رہے تھے اور اُس وقت بھی علامہ اقبال اور قائداعظم نے فلسطینیوں کی حمایت کے لیے عملی اقدامات کیے اور بیانات بھی دیے تھے۔ پاکستان اگر اپنی اسلامی نظریاتی اساس سے پیچھے ہٹتا ہے تو یہ اپنی ہی جڑ کاٹنے والی بات ہوگی۔ پاکستان میں ایک لسانی قومیت تو آباد ہے نہیں بلکہ یہاں تو پنجابی بھی ہیں، پٹھان بھی ہیں، سندھی بھی ہیں، بلوچ بھی ہیں، سرائیکی بھی ہیں، کشمیری بھی ہیں اور اس کے علاوہ بھی دیگر کئی اقوام اس ملک میں آباد ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے ملک میں اتحاد صرف اور صرف اسلامی نظریے پر ہی ممکن ہے اور اس اسلامی

نظریے کے مطابق فلسطین کی حمایت کرنا ہم پر لازم ہے۔ اس لیے تاریخ کا قرض جو ہم نے پاکستان کو اسلامی نظریاتی ریاست بنا کر لیا تھا، اس کو واپس ادا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم ساری دنیا میں جہاں بھی مسلمان محکوم اور مجبور ہوں ان کی مدد کریں۔ فلسطین اس وقت پوری اسلامی دنیا کے لیے ایک ایسا مسئلہ بن چکا ہے جو اول درجے کی اہمیت کا حامل ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں جس کے عوام کے دل فلسطین کے ساتھ نہ دھڑکتے ہوں، تو ایسے میں پاکستان اِس دوڑ میں کیسے پیچھے رہ سکتا ہے؟

دوسری وجہ ہے پاکستان کی داخلی صورتحال۔ پاکستان اس وقت ایک بحران کا سامنا کر رہا ہے۔ ملک میں قومی اتحاد بہت کمزور ہو چکا ہے۔ ایسے میں فلسطین کا مسئلہ پاکستان کی پوری قوم کو متحد کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ جو لوگ یہ بات کرتے ہیں کہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم کر لے، وہ یا تو پاکستان کی قوم کے جذبات سے واقفیت نہیں رکھتے یا پھر وہ لوگ پاکستان کے دشمن ہیں اور چاہتے ہیں کہ پاکستان کے اندر اتحاد کا یہ بحران مزید گہرائی طرف چلا جائے۔ کیونکہ یہ بات تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ پاکستان کی عوام کبھی بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کے فیصلے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے گی اور کوئی بھی حکومت جو اسرائیل کو تسلیم کرنے کی جرأت کرے گی، اُسے عوام کے بے پناہ غم و غصے کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ صورتحال تو پاکستان کو خانہ جنگی تک بھی لے جا سکتی ہے۔ اس وقت فلسطین کی حمایت کر کے ہم پاکستان کو بھی متحد کر سکتے ہیں، پاکستان میں بھی غیرت کی جوت جگا سکتے ہیں، پاکستان میں بھی صحیح اسلامی جذبہ پیدا کر سکتے ہیں اور اسی طریقے سے ہم پاکستان کے بہت سارے مسائل کا حل بھی نکال سکتے ہیں۔ مسائل کا حل ڈالروں یا پروپیگنڈوں میں نہیں ہوتا بلکہ قومی مسائل کا حل قومیں خود ہی کر سکتی ہیں اور ایک متحد قوم ہی اپنے مسائل کا درست حل نکال سکتی ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے 1937 میں علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ہمیں برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک کو مضبوط کرنے کے لیے فلسطین کے مسئلے کو اجاگر کرنا ہوگا۔ انہوں نے یہ بات بھی لکھی تھی کہ فلسطین کا مسئلہ ہر مسلمان کو عزیز ہے اور اس کے ذریعے وہ مسلمانوں کو ہندوستان کے اندر بھی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے پر زیادہ اچھے

طریقے سے آمادہ کر سکتے ہیں اور یہ تب ہی ممکن ہے اگر وہ فلسطین کے مسئلے کو ساتھ لے کر چلیں۔

تیسری وجہ تزویراتی (Strategic) ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ دنیا کی سب سے بڑی عالمی طاقت بن کر ابھرا اور ایک لحاظ سے دنیا کے ایک بڑے حصے پر امریکہ کی حاکمیت قائم ہوگئی۔ امریکہ ہمیشہ سے اسرائیل کا سب سے بڑا اتحادی رہا ہے۔ اگر آپ امریکہ کے اندر یہودیوں کی طاقت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو سمور لپسیٹ اور اَرل راب کی کتاب "Jews and the New American Scene" کے اِس اقتباس کو زیر غور لائیے: "امریکہ کے دو چوٹی کے ماہرِ سماجیات کے مطابق بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں یہودی امریکہ کے چوٹی کے دانشوروں کا 50 فی صد، سائنس اور معاشیات میں نوبل انعام جیتنے والوں کا 40 فی صد، بہترین امریکی یونیورسٹیوں کے پروفیسرز کا 20 فی صد، اعلیٰ درجے کے سرکاری افسران کا 21 فی صد، نیویارک اور واشنگٹن کی بہترین قانونی فرمز کا 40 فی صد، میڈیا کے بڑے اداروں میں رپورٹرز، ایڈیٹرز اور میڈیا مالکان کا 26 فی صد اور مشہور ترین فلموں کے ہدایت کاروں اور لکھاریوں کا 59 فی صد تھے۔"

یہ بات تو واضح ہے کہ جس طرح اقبال نے فرمایا تھا: "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے" اسی طرح امریکہ کی رگِ جاں پنجۂ صیہون میں ہے۔ صیہونیوں کا امریکہ اور اس کے تمام اداروں، چاہے وہ سرکاری ادارے ہوں، پرائیویٹ میڈیا کے ادارے ہوں یا بنک ہوں، پر تسلط قائم ہے۔ چنانچہ امریکہ سے توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ فلسطین کی مدد کرے گا۔ دوسری طرف اب دنیا میں دوسری ابھرتی ہوئی عالمی قوت چین کا جھکاؤ عربوں کی طرف ہے اور چین سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ جیسے جیسے وہ مزید طاقت ور ہوتا جائے گا، وہ اسرائیل کو روکے گا اور فلسطین کی حمایت کرے گا۔

یہاں پر اگر ہم پاکستان کی بات کریں تو پاکستان کا چین کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ پاکستان سی پیک (China Pakistan Economic Corridor) کے ذریعے سے چین کے ساتھ معاشی رشتے میں بھی بندھا ہوا ہے اور پاکستان کی افواج کا 80 فی صد اسلحہ چین سے درآمد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر موقع پر چین ہی پاکستان کی مدد کو آتا ہے جیسے کہ حالیہ

پاک بھارت جنگ میں بھی دیکھا گیا۔ اب جب چین اور امریکہ کے مابین ایک مقابلے اور کشمکش کا آغاز ہونے کو ہے تو پاکستان کو بھی کسی ایک پلڑے میں اپنا وزن رکھنا پڑے گا۔ اگر ہم فلسطین کی حمایت کرتے ہیں اور اسرائیل کی مخالفت کرتے ہیں تو چین کے ساتھ ہمارا تزویراتی تال میل مزید گہرا ہو جائے گا اور مشرقِ وسطیٰ کے اندر چینی قوت کے ذریعے جو ایک منظرنامہ ترتیب پانے والا ہے، اُس میں پاکستان کو ایک اہم مقام حاصل ہوگا۔ دوسری طرف اگر ہم امریکی غلامی میں ہی پھنسے رہے اور امریکہ کو خوش کرنے کی غرض سے ہم نے فلسطین کی حمایت ترک کر دی یا پھر اسرائیل کو تسلیم کرنے کی کوشش کی تو پھر عالمِ اسلام میں بھی ہم کو نہ ہی برادرانہ نگاہ سے دیکھا جائے گا اور نہ ہی ہم چین کے ساتھ شراکت کے ذریعے مشرق وسطیٰ میں تزویراتی فوائد حاصل کر سکیں گے۔ اس طرح فلسطین کی حمایت نہ کرنا تزویراتی طور پر بھی پاکستان کے لے نقصان دہ ثابت ہوگا۔

چنانچہ اگر ہم عقل پسندی کی عینک پہن کر بھی فلسطین اور اسرائیل کے مسئلے کو دیکھیں تو ہم پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تزویراتی، داخلی اور تاریخی و نظریاتی اعتبار سے پاکستان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ فلسطین کی بھرپور حمایت اور اسرائیل کی ناجائز ریاست کی بھرپور مخالفت کرے۔ اگر ہم نے اس معاملے پر اپنا موجودہ منافقانہ رویہ اختیار کیے رکھا تو ہم ان تمام فوائد سے محروم رہ جائیں گے جو فلسطین کی حمایت کر کے ہم حاصل کر سکتے ہیں اور اسرائیل کی حمایت یا اس معاملے پر خاموشی اختیار کرنے سے تو ہمیں ویسے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہونا بلکہ الٹا ہم نقصان ہی اٹھائیں گے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

حرفِ آخر

اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ عام پاکستانی عوام اپنے فلسطینی بھائیوں کی کیسے مدد کرسکتے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستانی عوام کی بھاری اکثریت کو مسئلہِ فلسطین کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ مسئلہِ فلسطین اور اس کی باریکیوں سے آگہی حاصل کی جائے، تاکہ عام لوگوں کو یہ معلوم ہوسکے کہ فلسطین میں کتنی بڑی زیادتی اور نسل کشی (Genocide) جاری ہے اور اس کے پیچھے کون کون سی قوتیں اور عوامل کارفرما ہیں۔ جب کوئی شخص خود علم حاصل کرلیتا ہے تو اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس علم کو پھیلائے اور معاشرے میں آگہی (Awareness) پیدا کرے۔ جب تک مسئلہِ فلسطین کا علم نہ ہوگا، تب تک ہم فلسطین کے ساتھ کماحقہ جذباتی وابستگی بھی پیدا نہ کرسکیں گے۔

غزہ میں تقریباً دو سال سے خوف ناک ترین قتلِ عام جاری ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسئلہِ فلسطین کو لے کر پاکستانی عوام کی طرف سے بہت زیادہ یک جہتی کا جذبہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ پاکستانی عوام کی بھاری اکثریت کے پاس علم کا فقدان ہے اور اسی وجہ سے ان میں جذباتی وابستگی بھی پیدا نہیں ہورہی۔ علم حاصل کرنا جذباتی وابستگی پیدا کرنے کا پہلا زینہ ہے اور کسی بھی انسان کے لیے، جو فلسطین کے لیے کوئی عملی کام کرنا چاہتا ہے، علم اور جذباتی وابستگی ایک ساتھ لازم وملزوم ہیں۔

عملی طور پر عام لوگ بھی فلسطین کی خاطر خواہ مدد کرسکتے ہیں۔ سب سے پہلے تو فلسطین کے لیے معاشرے میں آگہی پھیلائیں اور اسرائیلی وامریکی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں، کیونکہ بائیکاٹ کا حربہ عالمی طور پر اسرائیل اور اس کے حمایتیوں کے خلاف کافی مؤثر ثابت ہورہا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں بائیکاٹ کا نام تو کافی لیا جاتا ہے، لیکن عملی طور ایک منظم بائیکاٹ دیکھنے میں نہیں آرہا۔ بائیکاٹ تب ہی کامیاب ہوتا ہے جب اسے ایک اچھی حکمتِ عملی اور واضح اہداف کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جائے۔ اس وقت اسرائیل کا سب سے بڑا حمایتی امریکہ ہے، لیکن یہ بات عوام کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ تمام امریکی مصنوعات کا بائیکاٹ کردیں۔ اس سلسلے میں

بہتر طریقہ یہی ہے کہ اسرائیل کی امداد کرنے والی تنظیموں اور کمپنیوں کو تلاش کر کے ایک ایسی بائیکاٹ فہرست بنائی جائے، جس میں ان کمپنیوں کے نام شامل کیے جائیں جو اسرائیل کی سب سے بڑی حمایتی ہیں۔ اس کے بعد اتنی شدت سے بائیکاٹ کیا جائے کہ وہ کمپنیاں پاکستان سے اپنا پوریا بستر گول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس طرح ہم فلسطینی بھائیوں کی گھر بیٹھ کر بھی مدد کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمیں فلسطینیوں کی مدد کے لیے عطیات دینے چاہییں۔ جتنی تباہی اسرائیل غزہ میں کر چکا ہے، اس کو دوبارہ ٹھیک کرنے کے لیے یقیناً بہت زیادہ رقم درکار ہوگی۔ اس لیے اگر ہم لوگ اور کچھ نہیں کر سکتے، تو کم از کم اپنی آمدنی کا ایک حصہ فلسطین کے لیے مختص کریں اور فلسطین کے لیے دل کھول کر عطیات دیں۔ ایثار اور قربانی کے بغیر کبھی بھی کوئی نیک کام مکمل نہیں ہو سکتا اور اسی جذبے کے تحت ہی ہمیں بائیکاٹ اور عطیات والے کام کرنے چاہیں۔ اس کے ساتھ ہم اپنی حکومت پر جتنا دباؤ ڈال سکتے ہیں، ہمیں ڈالنا چاہیے کہ وہ فلسطین کی مدد کے لیے اپنی پوری عسکری اور معاشی طاقت لگانے کے لیے تیار ہو جائے۔ مختصراً بنیادی طور پر چار چیزیں ہیں، جو عام لوگ فلسطین کی حمایت کے لیے کر سکتے ہیں، جن میں بائیکاٹ، عطیات، آگہی (Awareness)، اور اپنی حکومت پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ فلسطین کی حمایت کرے۔

فلسطین پاکستان کو کیسے آزاد کرا سکتا ہے ؟

(یہ مضمون راقم کے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ہے جو اگست 2024 میں شائع ہوا تھا۔)

قلندر میلِ تقریرے ندارد
بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد
ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خونِ شبیرے ندارد

(" یہ قلندر تقریر کی خواہش نہیں رکھتا، مگر اس نکتے کو بتائے بغیر چارا نہیں کیونکہ یہی نکتہ اکسیر ہے، اس خراب کھیتی سے کبھی کچھ حاصل نہ ہوگا، جس کو شبیر کے خون سے سیراب نہیں کیا جاتا"۔)

جی ہاں ! آپ نے مضمون کا عنوان درست پڑھا ہے۔اس مضمون میں، میں یہی بیان کروں گا کہ نسل کشی (Genocide) کا مارا ہوا فلسطین کیسے دنیا کی واحد مسلمان ایٹمی ریاست کو آزاد کرا سکتا ہے۔ عام لوگوں سے لے کر دانش وروں تک بہت سے لوگ آج کل یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ پاکستان فلسطین کو کیسے آزاد کرا سکتا ہے۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔حماس کے رہنما اور فلسطین کے وزیر اعظم اسماعیل ہانیہ کی شہادت کے بعد" غزہ بچاؤ مہم" کی طرف سے اسلام آباد میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ کا اعلان کیا گیا۔غزہ کی کل آبادی سے کہیں زیادہ لوگ راولپنڈی اور اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ لاکھوں کی اس آبادی میں سے کل دو سو لوگ ہی جنازہ پڑھنے تشریف لائے۔ البتہ جنازہ پڑھنے والوں سے کہیں زیادہ تعداد میں پولیس وہاں ضرور موجود تھی۔ جنازہ پڑھنے کے لیے آنے والے ایک نوجوان لڑکے کو میں نے ایک پولیس انسپکٹر صاحب سے باتیں کرتے سن لیا۔ انسپکٹر صاحب اس لڑکے کو بتا رہے تھے: " بیٹا! عرب اور ایرانی بالکل بیکار ہیں۔ یہ تو ہم پاکستانی ہی ہیں جو مسجد اقصیٰ کو آزاد کرائیں گے۔لیکن پہلے ہم نے غزوۂ ہند لڑنا ہے۔ بھارت کو دھول چٹانے کے بعد ہم اسرائیل کے ٹکڑے

ٹکڑے کر دیں گے۔" میں بہت زور سے ہنسنا چاہتا تھا لیکن موقع کچھ ایسا تھا کہ ضبط کر گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انسپکٹر صاحب سمیت پولیس کے کسی اہلکار نے فلسطین کے شہدا کے قائد کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

میں ایک عقلیت پسند انسان ہوں۔ عقل اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ حقیقت مانی جائے کہ اپنی بڑائی کے فریب (Delusion of Grandeur) میں مبتلا، بے حسی اور تعصب کی شکار اشرافیہ کے ہاتھ میں مقبوض اور بے پناہ جہالت کا حامل ہمارا ملک فلسطین تو کجا اپنے کشمیری حصے کو بھی آزاد نہیں کروا سکتا۔ پاکستان کی تاریخ، خصوصاً پچھلے تیس پینتیس سالوں میں، اس بات کی گواہ ہے کہ موجودہ حالت میں تو پاکستان خود کو بھی امریکی ذہنی اور معاشی غلامی سے آزاد نہیں کروا سکتا۔ چنانچہ یہ سوال پوچھنا کہ پاکستان فلسطین کو کیسے آزاد کرا سکتا ہے، بالکل بچگانہ اور غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ صرف پاکستان کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ پوری اسلامی دنیا اپنے آپ کو بڑائی کے فریب اور غلط فہمی کے دھوکے میں رکھے ہوئے ہے۔ اس وجہ سے ہم فلسطین کی جو تھوڑی بہت مدد کر سکتے ہیں وہ بھی نہیں کرتے۔ پاکستان اور دیگر اسلامی ریاستوں کا طرزِ عمل بالکل اس پولیس انسپکٹر کی طرح ہے جو بھارت اور اسرائیل کو تباہ کرنے کی بڑھکیں تو ضرور مارتا ہے مگر عملاً پاکستان کی مغربیت زدہ اشرافیہ کا زرخرید غلام ہے۔ پاکستان کی یہ مغربیت زدہ اشرافیہ خود مغرب کی ذہنی غلام ہے اور اس کا واحد مقصدِ حیات یہی ہے کہ پاکستان کو لوٹ کھسوٹ کر مغرب میں اپنی اولادوں کے لیے شداد کی ایک شاندار جنت تعمیر کی جائے، جس کی آبیاری پاکستانی سسکتی عوام کے خون اور پسینے سے کی جائے۔

اگر ہم واقعی فلسطین کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے پاکستان کو آزاد کرانا ہوگا۔ 1947 میں ہمیں آزادی حاصل کرنے کا ایک موقع ملا تھا لیکن ہم نے اسے گنوا دیا اور مغرب کی غلام اشرافیہ کو اپنے اوپر از سرِ نو مسلط کروا دیا۔ سو یہ بات واضح ہے کہ ہمیں بیرونی امداد چاہیے۔ لیکن فلسطین، ایک ایسا ملک جو دنیا کے نقشے پر بھی نہیں، جس میں خوفناک نسل کشی (Genocide) چل رہی ہے، اور جس کی زیادہ تر آبادی قابلِ رحم پناہ گزینوں پر مشتمل ہے، کیسے پاکستان کو آزاد کرا سکتا ہے؟ نہ وہ پاکستان کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کے لیے کوئی مالی

امداد دے سکتا ہے اور نہ ہی وہ پاکستان کی مغربی غلام اشرافیہ کو تخت سے اتارنے کے لیے کوئی فوج بھیج سکتا ہے۔ لیکن فلسطین پاکستان کے لیے ایک بہت اہم کام کر رہا ہے۔ فلسطین اپنا خون دے کر پاکستانی عوام کو نفسیاتی طور پر تحریک دے رہا ہے کہ وہ بے حسی اور سستی کو ترک کریں اور غیرت مند مسلمانوں کی طرح اُٹھ کھڑے ہوں۔

اس مضمون کے آغاز میں علامہ اقبال کی زندگی کے آخری اشعار لکھے گئے ہیں۔ اقبال نے اپنی آخری سانس کے ساتھ بھی یہی بتایا کہ غلامی کے ریگستان کو آزادی کے نخلستان میں بدلنے کے لیے خون درکار ہوتا ہے۔ پاکستان ایک قوم پرست ریاست کے طور پر نہیں بنایا گیا تھا۔ اقبال اور جناح نے یہ واضح کیا تھا کہ پاکستان اسلامی دنیا کی ہراول ریاست ہوگی، جو پوری دنیا کے مسلمانوں کا دست و بازو بنے گی۔ پاکستان بننے سے ایک سال پہلے ہی قائداعظم محمد علی جناح نے "نیویارک ٹائمز" کو انٹرویو دیتے ہوئے کھل کر کہہ دیا تھا کہ اگر فلسطین کی آزادی کے لیے پاکستان کو تلوار بھی اٹھانا پڑی تو پاکستان پیچھے نہ ہٹے گا۔ پاکستان کو بناتے وقت ہم نے تاریخ سے یہ عہد کیا تھا کہ پاکستان اپنے اسلامی نظریے سے وفادار رہے گا۔ جو اقوام تاریخ سے کیے گئے معاہدے توڑ دیتی ہیں، تاریخ ان سے بڑا بھیانک انتقام لیتی ہے۔ پاکستان کے لوگ ہی اب پاکستان کو بچا سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے لوگ بے حسی کا لبادہ اوڑھ کر سوئے ہوئے ہیں۔

یہاں فلسطین کا کردار سامنے آتا ہے۔ کچھ اندازوں کے مطابق اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں ایک لاکھ 86 ہزار فلسطینی جان کی بازی ہار چکے ہیں۔ اگر معصوم بچوں کی مسخ شدہ لاشیں، ان کی ماتم کرتی مائیں، قیمہ بنے ہوئے جسم اور کھلے عام فلسطینیوں کی عصمت دری کے واقعات، اسلام کے نام پر بننے والے پاکستان کی قوم کو نہیں جگا سکتے تو پھر یہ قوم کبھی نہ جاگے گی۔ اور اگر یہ قوم اب نہیں جاگتی تو جلد یا بدیر ہمارے اپنے شہر غزہ کا نقشہ پیش کر رہے ہوں گے۔ ہندوتوا کے جنونی پاکستانیوں کے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو آج غزہ میں ہو رہا ہے اور ہمارے لیے کوئی راہِ فرار نہ ہوگی۔ 1492 میں سقوطِ غرناطہ سے پہلے مسلم سپین کو بچایا جا سکتا تھا، مگر وہ قوم نہ جاگی۔ 1492 کے بعد، جب ان کی ریاست چھن گئی، تو ان کے لیے واپسی کا کوئی راستہ باقی

نہ رہا۔ان کی کوششیں رائگاں گئیں اور وہ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے گئے۔

فلسطینیوں کے پاس بھی کئی راستے تھے۔ وہ اسرائیلی غلامی قبول کر سکتے تھے۔ وہ جلاوطنی بھی قبول کر سکتے تھے اور جلاوطنی کے عوض امریکہ ان کو اربوں ڈالر دینے پر بھی تیار تھا۔لیکن انہوں نے شہادت اور عظیم قربانی کا راستہ چنا۔آخر کیوں؟ حماس کبھی بھی یہ توقع نہ کر سکتی تھی کہ وہ اسرائیل اور امریکہ کی عسکری قوت کو شکست دے سکے گی۔اگر ہم اس" جنگ" کا تجزیہ کریں تو یہ بات واضح ہے کہ اس جنگ کے نتیجے میں اسرائیل نے فلسطینیوں کا خوفناک قتل عام کرنا ہی تھا۔ پھر کیوں فلسطینیوں نے جنگ ہی کو چنا؟ ہر وہ شخص جو حسینیت کے نظریے کو سمجھتا ہے اس سوال کا جواب دے سکتا ہے۔امام حسین علیہ السلام کربلا میں کیوں لڑے؟ ہزاروں کے یزیدی لشکر کو 72 اشخاص کبھی بھی ہرا نہیں سکتے تھے۔پھر کیوں لڑے وہ؟

علامہ اقبال کے روحانی شاگرد اور مشہور ایرانی فلاسفر علی شریعتی اس کا جواب کچھ یوں دیتے ہیں:" امام حسین دو ممکنات کے درمیان کھڑے ہیں۔نہ وہ ظلم کے سامنے خاموش رہ سکتے ہیں اور نہ ہی وہ جابر سے جنگ کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ان کے پاس ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ ہے موت۔اگر وہ دشمن کو شکست نہیں دے سکتے تو اس کے ہاتھوں اپنی موت کے ذریعے وہ جابر کے ماتھے پر رسوائی کا ایسا داغ لگا سکتے ہیں جو تا قیامت قائم رہے۔وہ ظلم کے نظام کو توڑ تو نہیں سکتے ،لیکن وہ اس کو لعنت زدہ ضرور بنا سکتے ہیں۔اُن کے لیے شہادت گھاٹے کا سودا نہیں، بلکہ ایک ایسا راستہ ہے جو انہوں نے خود چنا۔وہ اپنے آپ کو اسلام اور آزادی کی راہ میں قربان کر دیں گے اور ہمیشہ کے لیے غالب ہو جائیں گے" (ظلم کے ہر نظام کے لیے ڈراؤنا خواب بن جائیں گے)۔غزہ میں ہزاروں فلسطینی اپنا خون دے کر خوابیدہ مسلم امت کو جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ان کا خون رنگ لانا بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ محض اتفاق نہ تھا کہ جب بنگلہ دیش میں عوام اپنی بھارتی پٹھو اور جابر حکومت کو نکالنے کے لیے سڑکوں پر آئے تو ان میں سے ہزاروں کے ہاتھوں میں فلسطین کے جھنڈے تھے۔ بنگلہ دیش نے کامیاب انقلاب کے ذریعے حقیقی آزادی حاصل کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھالیا ہے اور اس میں فلسطینی عوام کے خون نے ان کی بھرپور مدد کی ہے۔اب وقت آن پہنچا ہے کہ ہم بھی اپنے بچھڑے ہوئے بنگلہ دیشی بھائیوں کی

طرح فلسطینیوں کے خون سے تحریک پکڑیں۔اس طرح ہم مختلف نسلوں اور فرقوں سے بالاتر ہو کر قوم کو جگا سکتے ہیں اور ایک واقعتاً آزاد پاکستان کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔وہ پاکستان جس کا خواب اقبال اور جناح نے دیکھا تھا، وہ پاکستان جو تاریخ سے کیا گیا اپنا وعدہ پورا کرے گا اور قائدِ اعظم کے الفاظ کے مطابق فلسطین کی آزادی کے لیے تلوار اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔

کتابیات:

اس کتاب میں موجود اکثر تاریخی حقائق مندرجہ ذیل کتب سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جو بھی حضرات مسئلہِ فلسطین کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ درج ذیل کتب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

1."Palestine and the Arab-Israeli Conflict" by Charles Smith.

2. "Israeli Exceptionalism-The Destabilizing Logic of Zionism" by Shahid Alam.

3."A History of Israel" by Howard Sachar

4. "The Hundred Years War on Palestine" by Rashid Khaledi.

5."The Ethnic Cleansing of Palestine" by Ilan Pappe.

6."Elusive Victory- The Arab-Israeli Wars,1947-1974" by Trevor Dupuy.

7."The Jewish State" by Theodore Herzl.

8."The Origins of Zionism" by David Vital

9."The Saga of the Deir Yassin Massacre, Revisionism and Reality" by Daniel McGowan and Matthew Hogan

10."The Revolt" by Menachem Begin

11."Collusion across the Jordan" by Avi Shlaim

12."1948:A History of the First Arab-Israeli War" by Benny Morris.

13."Six Days of War:June 1967 and the Making of the Modern Middle East" by Michael Oren.

14."The 1967 Arab-Israeli War: Origins and Consequences" edited by Avi Shlaim and W. Roger Louis.

15."A History of the Modern Middle East" by William Cleveland.

16."Dispossessed-The Ordeal of the Palestinians" by David Gilmour.

17."The Palestinian Uprising" by Robert Hunter.

ISBN

9 786279 478207 >

ڈاکٹر حسان بخاری پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں مگر تاریخ کے مطالعے اور تجزیے کا شوق رکھتے ہیں۔ 2019 میں سی ایس ایس کے امتحان میں پاکستان میں چونتیسویں پوزیشن حاصل کر کے پولیس سروس آف پاکستان میں منتخب ہوئے مگر انہوں نے تاریخ پر آزادانہ تحقیق اور تجزیہ کرنے کو سرکاری نوکری کی قیود پر ترجیح دی۔ کئی جریدوں میں ان کے مضامین باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں اور بین الاقوامی روسی چینل Russia Today پر ان کو ایک تجزیہ کار اور تاریخ دان کی حیثیت سے بلایا جاتا ہے۔ ان کا اپنا یوٹیوب چینل "تاریخ اور تجزیہ" کے نام سے قائم ہے جس پر بہت سے قومی اور تاریخی واقعات پر ان کی تحقیقاتی ویڈیوز موجود ہیں۔ گزشتہ سال سانحہ مشرقی پاکستان 1971 کے بارے میں ان کی ایک کتاب "Forks in the Road" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر حسان بخاری مسئلہ فلسطین میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے یوٹیوب چینل پر مسئلہ فلسطین کی مفصل تاریخ انگریزی اور اردو زبان میں موجود ہے۔ وہ "غزہ بچاؤ مہم" کے رضاکاروں کے لئے تدریسی خدمات بھی سرانجام دیتے رہے اور "مسئلہ فلسطین کی مختصر تاریخ" انہی تدریسی کاوشوں کے دوران میں تحریر کی گئی تاکہ عام فہم زبان میں فلسطین کی دردناک تاریخ کو پاکستان کے عوام، خصوصاً نوجوان نسل تک پہنچایا جائے۔

